www.shibliinternational.com

مئی 2018

ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد

Urdu Monthly **SADA E SHIBLI** Hyderabad

ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

-/10 روپے

مئی ۲۰۱۸ء

علمی، ادبی، سائنسی، مذہبی، سماجی اور معلوماتی شاہکار

جلد: ۵۔ شمارہ: ۴

ماہنامہ

صدائے شبلی

حیدرآباد

مدیر: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران: ڈاکٹر سراج احمد انصاری، ڈاکٹر عبدالقدوس، ابوہریرہ یوسفی

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، پروفیسر مظفر علی شہ میری

حضرت رحمٰن جامی، پروفیسر محسن عثمانی ندوی پروفیسر ابوالکلام

پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی، ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی

مولانا ارشاد الحق مدنی، مولانا محمد مساعد ہلال احیائی

اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ، محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق، ڈاکٹر حمران احمد، ڈاکٹر جاوید کمال

ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر غوثیہ بانو

ڈاکٹر سید امام حبیب قادری، ڈاکٹر سمیہ تمکین

ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ، ڈاکٹر محمد زبیر، ڈاکٹر مصطفیٰ خان

ابوہریرہ (اینکر: نیوز 18) محسن خان

MOHD MUHAMID HILAL
A/c: 52023475202
Ifsc: SBIN0020413
Micr: 500002311 Branch: Dabeerpura Hyd

قیمت فی شمارہ: 10

سالانہ: 120 - بیرونی ممالک: 50/امریکی ڈالر

خصوصی تعاون: 1000

ماہنامہ "صدائے شبلی" حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352, B1, 2nd Floor,Bafana Complex,
Near Asfya Masjid Dabirpura Road, Purani Haveli,Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اداریہ	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	5
۲	رمضان المبارک میں کرنے کے ضروری کام	مفتی امانت علی	6
۳	امن کا فرشتہ مولانا امداداللہ رشیدی	ڈاکٹر الحاج عبدالرؤف	11
۴	سحری (مفہوم، اہمیت وآداب)	مولانا عبدالمنان مظہر مبارک پوری	14
۵	علم کی فضیلت واہمیت	ڈاکٹر مصلح الدین نظامی	17
۶	اے بلبلو! پھر پیار کا نغمہ چلو گائیں	احمد نورعینی (ریسرچ اسکالر)	19
۷	جدید غزل کے موضوعات	بشیر النساء (ریسرچ اسکالر)	20
۸	عہد وسطیٰ میں علمی تراجم کے باعث نشاۃ الثانیہ کا وجود	محمد عدنان (ریسرچ اسکالر)	23
۹	درد کی ایک غزل: تفہیم وتجزیہ	شازیہ تمکین (ریسرچ اسکالر)	26
۱۰	حضرت سید نصیرالدین شاہ چراغ دکن علیہ الرحمہ	حکیم سید شاہ محمد خیرالدین قادری صوفیؔ	33
۱۱	حکایتوں اور لوک کہانیوں میں حظ وانبساط کا پہلو	ڈاکٹر بلال احمد میر	34
۱۲	رمضان کے روزے (نظم)	حضرت رحمٰن جامیؔ	38
۱۳	غزل	ڈاکٹر احمد علی برقیؔ	39
۱۴	غزل	شکیل حیدر	39
۱۵	دولت مشترکہ کھیل: ہندوستان کی شاندار کارکردگی	ابوہریرہ (اینکر: نیوز 18)	40
۱۷	القاموس الازہر ایڈوانس (اردو۔عربی)	مبصر: عزیر احمد	41

☆☆☆

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

الحاج نواب **حیدر علی**، کنگ کوٹھی حیدرآباد

الحاج **عبد الولی**، آغاپورہ حیدرآباد

ڈاکٹر سید **جلیل حسین** ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد

الحاج **محمد عبد الستار** سیکھ ویلیج سکندرآباد حیدرآباد

علی میاں احمد پٹھان رائے گڑھ (مہاراشٹر)

علی احمد عبد اللہ کونچالی، چیرمین مولانا ابوالکلام آزاد اردو ہائی اسکول) رائے گڑھ (مہاراشٹر)

اداریہ

لیجیے! آپ کی خدمت میں ماہِ مئی ۲۰۱۸ء کا شمارہ صدائے شبلی حاضر ہے، اسی ماہ کے وسط میں ماہِ مقدس رمضان المبارک کا آغاز ہورہا ہے، ادارہ قارئین کی خدمت میں رمضان المبارک کی پیشتر مبارکبادی پیش کررہا ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ رب العزت اس مہینے کو ہمارے لیے برکت ونجات کا ذریعہ بنائے اور اس کے فیوض وبرکات سے پوری دنیا میں امن وسلامتی ہو۔ (آمین یارب العٰلمین)

عصر حاضر میں کٹھوا اور اناؤ کے واقعات (یعنی عصمت دری، زنا بالجبر اور ریپ) نے ہندستان ہی کو نہیں بلکہ پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ پرنٹ میڈیا، الیکٹرانک میڈیا اور سوشل میڈیا کے ذریعہ جو احتجاج کی شکلیں سامنے آئی ہیں اور لوگوں کی طرف سے جس طرح درد وغصے کا اظہار ہوا ہے، اس سے یہی محسوس ہوتا ہے کہ بلاتفریق مذہب وملت ملک وسماج میں ابھی انسانیت زندہ ہے اور مٹھی بھر ہی لوگ ہیں جو معاشرے میں تعفن پھیلا رہے ہیں اگر غور سے دیکھا جائے تو گناہ اور مجرم کا ساتھ دینے والا اس کے کرنے والے سے بڑا مجرم ہے، کیونکہ گناہ کا ساتھ دینے والا گناہ کے پھیلانے کا باعث بنتا ہے۔ حکومت ہند نے دیر ہی سہی مگر موت اور پھانسی کا قانون بنا کر ایک اچھی پہل کی ہے۔ امید ہے کہ عدلیہ اور انتظامیہ عمل کرنے میں تاخیر، سستی اور جانب داری کا معاملہ نہیں کریں گے۔ علاوہ ازیں جو مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانے میں حائل ہوتے ہیں ان کے لیے بھی خاطر خواہ سزا ضرور تجویز کرنا چاہئے۔ مہاتما گاندھی جی نے آزادی کے بعد ہندستانی حکومت کو عدلِ فاروقی کو آئیڈیل بنانے کا مشورہ دیا تھا، آخر انہوں نے عدل فاروقی میں کیا دیکھا تھا؟۔ زنا کے پس منظر میں اگر ہم خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کے ایک فیصلے کو مدنظر رکھیں تو ہمیں ان کا فیصلہ قرآن مجید کی سورۃ نور کی آیت نمبر ۲ پر عمل کرتے ہوئے نظر آتا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے حقیقی بیٹے ابوشحمہ نے جب زنا کا اقرار کرلیا تو حضرت عمر فاروقؓ نے سو کوڑے مروانے میں باپ اور بیٹے کے رشتے کا ذرا بھی لحاظ نہیں کیا تھا اور جب مجمع عام میں اسّی کوڑے مارنے پر ابوشحمہ بے ہوش یا قریب المرگ ہوکر زمین پر گر گئے تو باپ نے بیس کوڑے اسی حالت میں مروائے، اس منظر کو دیکھ کر حاضرین پر سکتہ طاری ہوگیا اور قیامت تک جب بھی اس واقعہ کو سنا اور پڑھا جاتا رہے گا تو دل ودماغ میں کپکپی اور ارتعاشی کیفیت پیدا ہوجائے گی۔ یہ ہے مثال، اس طرح سزا ملنے کے بعد کیا سماج کے کسی فرد کو زنا کرنے کے لیے ستّر مرتبہ سوچنے پر مجبور نہیں ہونا پڑے گا؟

کٹھوا اور اناؤ کا واقعہ حد سے گزرنے کے بعد میڈیا کے توسط سے منظر عام پر آیا، اس جیسے واقعات ملک بھر میں کتنے ہوتے ہوں گے، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے، زنا بالجبر یا زنا بالرضا میں حکومت سے زیادہ سماج اور سوسائٹی قصوروار ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ خواتین حضرات زمینی سطح پر بیدار ہوجائیں، نیز سماجی، مذہبی، سیاسی قیادتوں کو چاہئے کہ عوام الناس میں اس بات کی بیداری پیدا کرے کہ ہندستان کی ترقی اور امن اس کے آئین پر عمل آوری اپنی تہذیب وثقافت اور صدیوں سے چلی آرہی روایتوں پر مبنی ہے۔

معزز قارئین! اس ماہ کا شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ آپ اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازیں اور ہمیں خط لکھیں، ادارہ آپ کا مشکور رہے گا۔ ان شاء اللہ آپ کے خطوط آئندہ رسالے میں شائع کیے جائیں گے۔ نیز رسالے کی ممبر سازی میں ہمارا بھرپور تعاون فرما کر شکریے کا موقع عنایت فرمائیں اور رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں آپ اپنی مخصوص دعاؤں میں اس ادارے کو یاد رکھیں، مہربانی ہوگی۔ قلم کاروں سے درخواست ہے کہ اپنے غیر مطبوعہ مضامین ان پیج فائل میں sadaeshibli@gmail.com پر ارسال کریں۔

شکریہ

ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

مفتی امانت علی قاسمی
استاذ دارالعلوم حیدرآباد

رمضان المبارک میں کرنے کے ضروری کام

رمضان المبارک نیکیوں اور برکتوں کا مہینہ ہے، اللہ تعالی کی الطاف وعنایات کے نزول کا موسم ہے، یہ نیکیوں کی بہار کا مہینہ ہے جس میں خزاں کی ویرانی نہیں ہوتی، بلکہ رحمت کی برسات ہوتی ہے، نیکیوں کی کاشت کی جاتی ہے اور ثواب و اخروی سرخ روئی کی فصل کاٹی جاتی ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جس کا ایک عشرہ رحمت، ایک عشرہ مغفرت اور ایک عشرہ جہنم سے خلاصی کا ہے، اس مہینے میں اعمال کا ثواب بڑھا دیا جاتا ہے اور نفل کا ثواب فرض کے برابر اور ایک فرض کا ثواب ستر فرض کے برابر ملتا ہے۔ یہ مہینہ اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، اپنی آخرت کو سنوارنے اور بنانے کا بہترین موقع ہے، اس لیے نیک بختوں اور آخرت کی کامیابی کے متوالوں کو اس مہینہ کی قدر کرنی چاہئے اور اس مہینہ کو اللہ تعالی کی رضا کے مطابق گزارنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس مہینے میں دنیوی اور معاشی ضروریات اور کاروبار میں کمی کر کے نیک کاموں میں اضافہ کرنا چاہئے، اس مہینہ کے جو مخصوص اعمال ہیں اس کا خوب اہتمام کرنا چاہیے، رمضان کی آمد سے پہلے ہی بہتر طریقے سے رمضان گزارنے کا منصوبہ بنانا چاہیے تاکہ ہمارا وقت ضائع نہ ہو اور ہم خیر و برکت سے محروم نہ ہو جائیں۔

رمضان المبارک کی خصوصیات

رمضان کو تمام مہینوں پر فضیلت حاصل ہے، یہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن کریم کا نزول ہوا، اس مہینے کے روزہ کو فرض قرار دیا گیا۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے رمضان کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ''تمہارے اوپر ایک مہینہ آرہا ہے جو بہت بڑا مہینہ ہے، بہت مبارک مہینہ ہے، اس میں ایک رات ہے (شب قدر) جو ہزار راتوں سے بڑھ کر ہے، اللہ تعالی نے اس کے روزے کو فرض قرار دیا اور اس کے رات کے قیام تراویح کو ثواب کی چیز بنایا ہے، جو شخص بھی اس مہینہ میں کسی نفل کو ادا کرے وہ ایسا ہے جیسا کہ غیر رمضان میں فرض ادا کرے اور جو شخص اس مہینہ میں کسی فرض کو ادا کرے وہ ایسا ہے جیسے غیر رمضان میں ستر فرض ادا کرے، یہ مہینہ صبر کا ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔ یہ مہینہ لوگوں کی غمخواری کرنے کا ہے، اس مہینہ میں مومن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے، جو شخص روزہ دار کو افطار کرائے تو یہ اس کے گناہوں کی معافی اور آگ سے خلاصی کا سبب ہے اور روزہ دار کے ثواب کی طرح اس کو ثواب ملے گا اور روزہ دار کے ثواب میں کمی نہیں کی جائے گی۔ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم میں سے ہر شخص اتنی وسعت نہیں رکھتا ہے کہ روزہ دار کو افطار کرائے تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ ثواب پیٹ بھر کر کھلانے پر موقوف نہیں بلکہ ایک کھجور سے افطار کرانے یا ایک گھونٹ پانی یا لسی پلانے سے بھی مل جائے گا، جو شخص اس مہینہ میں اپنے غلام اور خادموں کا بوجھ ہلکا کرے تو اللہ تعالی اس کی مغفرت فرما دیتے ہیں۔ (صحیح ابن خزیمہ، باب فضائل رمضان، حدیث نمبر ۱۸۸۷،)

رمضان المبارک میں کرنے کے کام

حدیث اگر چہ تفصیلی ہے، لیکن اس سے رمضان المبارک کی خصوصیات، فضائل اور اس میں کرنے کے چند ضروری کاموں کی نشان دہی ہو جاتی ہے اور رمضان کی قدر و عظمت کی ترغیب بھی ہوتی ہے۔ اس مہینہ میں ہمیں کن کاموں کا خوب اہتمام کرنا چاہیے اور کس طرح اوقات کو فارغ کر کے

اس مہینہ کو اپنے لیے خیر و برکت کا ذریعہ بنانا چاہیے اس کا مختصر تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے۔

رمضان المبارک کا روزہ

رمضان کا سب سے اہم عمل روزہ ہے، یہ اسلام کا ایک رکن ہے اور جس طرح نماز اور زکات فرض ہے اسی طرح رمضان کا روزہ بھی فرض ہے ۔ روزہ کی احادیث میں بڑی فضیلت آئی ہے، ایک حدیث میں ہے: ''روزہ ایک ڈھال ہے جس کے ذریعے بندہ جہنم کی آگ سے بچتا ہے،، (سنن النسائی، حدیث نمبر:۲۲۳۱) دوسری حدیث میں ہے: جس نے اللہ تعالی کے راستے میں ایک دن روزہ رکھا تو اللہ تعالی اس کے چہرے کو جہنم سے ستر سال کی مسافت کے بقدر دور کر دیتا ہے (صحیح مسلم، باب فضل الصیام، حدیث نمبر:۱۱۵۳) صحیح مسلم کی حدیث میں ہے: پانچوں نمازیں، ایک جمعہ دوسرے جمعہ تک اور ایک رمضان دوسرے تک کے گناہوں کا کفارہ ہوتے ہیں بشرطیکہ کبیرہ گناہوں سے پرہیز کیا جائے (صحیح مسلم باب الصلوات الخمس والجمعۃ، حدیث نمبر:۲۳۳) ایک دوسری حدیث میں ہے جس نے رمضان کے روزے اور اس کے بعد شوال میں چھ نفلی روزے رکھے وہ شخص ایسے ہے جیسے وہ ہمیشہ روزہ رکھنے والا ہے (صحیح مسلم، باب استحباب صوم ستۃ ایام من شوال حدیث نمبر:۱۱۶۴)

روزہ کے فوائد

روزہ کی بہت سی حکمتیں ہیں جو غور کرنے والوں کو حاصل ہو جاتی ہیں۔ حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے روزہ کے متعدد فوائد کا تذکرہ کیا ہے جس کو اختصار کے ساتھ یہاں ذکر کیا جاتا ہے (۱) روزہ سے انسان میں خشیت وتقوی کی صفت پیدا ہوتی ہے (۲) روزہ رکھنے سے انسان میں عاجزی ومسکنت اور خدا تعالی کے جلال اور اس کی قدرت پر نظر پڑتی ہے (۳) روزہ سے چشم بصیرت کھلتی ہے (۴) درندگی و بہیمیت سے دوری ہوتی ہے (۵) خدا تعالی کی شکر گزاری کا موقع ملتا ہے (۶) انسانی ہمدردی دل میں پیدا ہوتی ہے (۷) روزہ جسم ورح کی صحت و تندرستی کا سبب ہے (۹) روزہ انسان کی روحانی غذا ہے (۱۰) روزہ محبت الٰہی کا ایک بڑا نشان ہے (تحفہ رمضان ص:۳۱)

دعا کی کثرت

اس مہینہ میں دعا کی خوب کثرت کرنی چاہیے، اس لیے کہ یہ دعا کی قبولیت کا مہینہ ہے، اس مہینہ میں ہر شخص روزہ کی حالت میں ہوتا ہے جو اخلاص عمل کا بہترین نمونہ ہے، تراویح، تلاوت قرآن، ذکر و اذکار میں مشغول ہونے اور گناہوں سے دور رہنے کی وجہ سے انسان میں فرشتے کی مشابہت پیدا ہو جاتی ہے اور انسان میں معصومیت کی صفت آجاتی ہے اور بندہ اللہ تعالی کا محبوب اور پسندیدہ بن جاتا ہے، اس حالت میں جب اپنے رب سے مانگتا ہے، تو اللہ تعالی اسے نوازتے ہیں، اس لیے کہ بندے کا مانگنا اللہ تعالی کو بے حد پسند ہے، پھر اس مہینہ میں اللہ تعالی اپنی رحمت کے دہانے کھول دیتا ہے؛ اس لیے قبولیت کی زیادہ امید پیدا ہو جاتی ہے۔ البتہ دعا کی قبولیت کے جو آداب ہیں ان کی رعایت کرنی چاہیے، مثلا عام حالات میں حلال غذا کا اہتمام ہونا چاہئے اور حرام سے اجتناب ہونا چاہیے خاص طور پر رمضان المبارک میں حلال کا حد درجہ اہتمام کرنا چاہیے، باوضو ہو کر نہایت خشوع وخضوع، عاجزی اور خوف وگریہ زاری کے ساتھ دعا مانگنی چاہیے۔ افطار اور تہجد کے وقت دعائیں زیادہ قبول ہوتی ہیں، قبولیت کے یقین کے ساتھ خدا کی بارگاہ میں حاضری ہونی چاہیے۔ دعاؤں میں اس کا بھی خیال رہنا چاہیے کہ صرف اپنے لیے نہیں؛ بلکہ اپنے عزیز واقارب، رشتہ دار، دوست واحباب اور متعلقین کو بھی دعا میں یاد کریں اور ان کی ضرورتوں کے لیے خدا کے دربار میں بھیک کا ہاتھ پھیلائیں؛ اس لیے کہ ایک مسلمان کی اپنے بھائی

کے حق میں غائبانہ دعا زیادہ قبول ہوتی ہے اور جب بھی انسان اپنے بھائی کے لیے دعا کرتا ہے تو فرشتے اس پر آمین کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالی تجھے بھی اس کا مثل دے اور جب فرشتے ہماری ضرورت کے لیے دعا کریں گے تو اس کی قبولیت میں کیا شبہ رہ جائے گا۔

تلاوت قرآن

رمضان المبارک کو قرآن کے ساتھ خاص مناسبت ہے، اسی مہینہ میں قرآن کا نزول ہوا، آپ ﷺ حضرت جبریل امین کو ہر رمضان پورا قرآن سناتے تھے اور جس سال آپ ﷺ کا وصال ہوا، اس سال آپ نے دو مرتبہ دور سنایا تھا، آپ باوجود کہ قرآن کریم کے حافظ تھے لیکن بعض صحابہ سے آپ قرآن کریم سنا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام اس مہینہ میں قرآن کریم کا خوب اہتمام کرتے تھے، بعض صحابہ دس دن میں اور بعض سات دن میں اور بعض تین دن میں قرآن کریم ختم کرلیا کرتے تھے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ رمضان میں اکسٹھ قرآن ختم کیا کرتے تھے، دیگر اسلاف سے بھی قرآن کریم کی کثرت سے تلاوت ثابت ہے، اس لیے اس مہینہ میں قرآن کی خوب تلاوت کرنی چاہیے، البتہ ایک بات کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت کے آداب کی خوب رعایت ہو، ہمارے درمیان ایک بہت بڑی کمی یہ پائی جاتی ہے کہ ہم قرآن کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں، جس کی وجہ سے ہمیں تلاوت قرآن میں وہ لطف نہیں ملتا جو حضرات صحابہ اور اسلاف کو ملا کرتا تھا، ہمیں یہ بھی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ہم سے کیا خطاب کررہا ہے؟ اور اس کے کیا تقاضے ہیں ؟ اور ان تقاضوں پر کس طرح عمل کیا جاسکتا ہے ؟ اس لیے ضروری ہے کہ رمضان میں کم از کم تفسیر کے حلقے قائم کرکے قرآن فہمی کی کوشش کریں تاکہ ہم معانی ومفاہیم کو سمجھ کر تلاوت کرسکیں اگرچہ کہ قرآن کی تلاوت کا ثواب سمجھنے پر موقوف نہیں ہے بلکہ بغیر سمجھے پڑھنے پر بھی ثواب ملتا ہے، حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے لکھا ہے کہ ''ایک حیثیت سے اس شخص پر حق تعالی کی زبردست عنایت ہوگی جو بغیر سمجھے کلام اللہ شریف کی تلاوت کرتا ہو؛ کیوں کہ صرف حق تعالی کی محبت اس کا باعث ہو سکتی ہے، سو کلام اللہ کا اصل نفع اس کے سمجھنے پر موقوف نہیں ہے ''اس پر حضرت تھانویؒ نے امام احمد بن حنبلؒ کا ایک خواب نقل کیا ہے ''کہ امام احمد بن حنبلؒ نے حق تعالی سبحانہ کو خواب میں دیکھا، عرض کیا اے اللہ! وہ کون سا عمل ہے جو آپ سے زیادہ قریب کرنے والا ہے، ارشاد ہوا: وہ عمل تلاوت قرآن ہے ،آپ نے عرض کیا **بفهم او بلا فهم** مجھ کر یا بغیر سمجھے ارشاد ہوا **بفهم او بلافهم** سمجھ کر ہو یا بغیر سمجھے، راز اس میں یہ ہے کہ مصنف اپنے کلام کے پڑھنے سے خوش ہوا کرتا ہے، پس جب بندہ حق تعالی کے کلام کو پڑھے گا تو اللہ تعالی خوش ہوں گے۔ (تحفہ رمضان ص:۴۶)

تراویح

رمضان کے ساتھ قرآن کی اسی مناسبت کی وجہ سے رمضان میں ایک مخصوص نماز کو مسنون قرار دیا گیا ہے جسے تراویح کا نام دیا جاتا ہے۔ موطا مالک کی حدیث میں ہے حضور پاک ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالی نے تمہارے لیے رمضان کے روزے کو فرض کیا اور میں نے اس کی راتوں کو جاگنے یعنی تراویح کو مسنون کیا ہے (مسند احمد، حدیث عبدالرحمٰن بن عوف الزہری ،حدیث نمبر ۱۶۸۹) یحی بن سعید قطانؒ سے مروی ہے کہ حضرت عمر نے ایک شخص کو حکم دیا کہ لوگوں کو مسجد نبوی میں بیس رکعت تراویح پڑھائیں (مصنف ابن ابی شیبہ، باب کم یصلی فی رمضان من رکعۃ، حدیث نمبر ۷۶۸۲) حضرت سائب بن یزید سے روایت ہے کہ حضرت عمر کے عہد خلافت میں صحابہ وتابعین رمضان میں بیس رکعت تراویح پڑھا کرتے تھے (سنن الکبری للبیہقی، باب ماروی فی عدد رکعات القیام، حدیث نمبر ۴۳۹۰)

ائمہ اربعہ میں امام احمد، امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک تراویح بیس رکعت ہے، امام مالک کے نزدیک چھتیس رکعت ہے (المغنی لابن قدامہ ۲/ ۱۶۷) آج تک حرمین شریفین میں اسی سنت پر عمل ہورہا ہے، خلفاء راشدین کے زمانہ سے آج تک کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں تراویح بیس رکعت سے کم پڑھی گئی ہو۔ معلوم ہوا کہ تراویح بیس رکعت ہی سنت ہے اس لیے تراویح بیس رکعت ہی پڑھنا چاہئے۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک تراویح کی نماز سنت مؤکدہ ہے جس کا چھوڑنا جائز نہیں تراویح میں دو چیزیں علیحدہ علیحدہ سنت ہیں، پورے رمضان تراویح پڑھنا، یہ ایک الگ سنت ہے اور تراویح میں قرآن ختم کرنا یہ علیحدہ سنت ہے، حضرت تھانویؒ تراویح میں قرآن ختم کرنے کی حکمت پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ''قرآن کا نزول رمضان کے مہینہ میں ہوا پس جو شخص اس میں قرآن ختم کرتا ہے وہ تمام برکات کا وارث ہوجاتا ہے؛ کیوں کہ رمضان کا مہینہ تمام خیر و برکات کا جامع ہے اور ہر قسم کی خیر و برکتیں جو پورے سال ملتی ہیں وہ اسی عظیم الشان مہینہ کی برکت سے آتی ہیں، گویا اس مہینہ کی دل جمعی اور یکسوئی پورے سال کی جمعیت خاطر اور یکسوئی کا باعث ہوتی ہے اور اس مہینہ کی پراگندگی و بدحالی پورے سال کی بدحالی کا سبب ہوتی ہے اس لیے اس مہینہ میں تراویح کا اہتمام اور خاص طور پر ختم قرآن کا اہتمام ہونا چاہیے (تحفہ رمضان ص:۸۸) مولانا تھانوی کی اس بات سے ایک دوسری بات یہ نکلتی ہے کہ ہمیں رمضان میں عبادت کے لیے یکسو ہوجانا چاہیے اور ہر قسم کی مشغولی کو ترک کردینا چاہیے، بڑی محرومی کی بات ہے کہ ہم رمضان جیسے عظمت وفضیلت والے مہینے کو مشغولیت اور کھانے پینے اور عید کی تیاری میں گزار دیں اور بڑے ہی عقلمند اور خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو رمضان کو عبادت کے لیے فارغ کرلیتے ہیں اور تمام مشغولیت کو ترک کردیتے ہیں اس لیے کہ رمضان کی یکسوئی پورے سال کی یکسوئی کا باعث ہے۔

نماز تہجد

تراویح کے ساتھ اس مہینہ میں راتوں کو جاگنا اور تہجد پڑھنے کا خاص اہتمام کرنا سعادت و نیک بختی اور زندگی کو نیکی سے مالا مال کرنے کا باعث ہے، راتوں کو جاگنا، اللہ کے حضور عجز و نیاز بجالانا، عبادت کرنا، خدا کے دربار میں رونا گڑگڑانا، خدا کے سامنے ہاتھ پھیلانا، اور اپنی عبدیت و بندگی کا اظہار کرنا؛ یہ وہ چیزیں ہیں جو اللہ تعالی کو بہت پسند ہیں، موقع اور موسم کی مناسبت سے ہمیں بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے، رمضان میں سحری کے لیے عام طور پر اٹھتے ہیں اگر سحری سے پہلے خدا کے دربار میں حاضری لگادی جائے اور اپنی حاجت کا اظہار کردیا جائے تو یہ بہت بڑی سعادت ہے اور اگر اٹھنے اور سحری کرنے کے باوجود خدا کے حضور سجدہ نہ کیا جائے تو اس سے بڑی محرومی اور کیا ہوگی۔ قرآن کریم میں اللہ تعالی نے رحمٰن کے بندوں کی جو صفات بیان کی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ ''ان کی راتیں اپنے رب کے سامنے قیام و سجود میں گزرتی ہیں'' (الفرقان ۶۴) حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ''جس نے رمضان کی راتوں میں قیام کیا ایمان کی حالت میں ثواب کی نیت سے تو اس کے پچھلے گناہ معاف کردیے جاتے ہیں'' (موطا مالک، الترغیب فی الصلوۃ فی رمضان، حدیث نمبر: ۳۷۶) راتوں کو جاگنا اور عبادت کرنا آپ ﷺ کا عام معمول تھا بلکہ رمضان کے اخیر عشرے میں آپ ﷺ گھر والوں کو بھی اٹھانے کا اہتمام فرماتے تھے، آپ کی پیروی میں حضرات صحابہ و تابعین بھی راتوں کو جاگنے کا اہتمام کرتے تھے، اس لیے خیر کے طالب اور نیکی کے متلاشی کو رمضان کی راتوں میں جاگنے کا اور رات کے آخری حصے میں تہجد پڑھنے اور خدا سے مانگنے کا اہتمام کرنا چاہیے؛ اس لیے کہ اس وقت جاگنا اور رب سے مانگنا انتہائی اہمیت اور بڑے اجر و ثواب کا حامل ہے۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالی رات کے آخری پہر میں آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے اور اللہ کا منادی آواز لگاتا ہے کہ

کون ہے جو مجھ سے مانگے اور میں اس کی دعا قبول کروں؟ کون ہے جو مجھ سے سوال کرے اور میں اس کو عطا کروں؟ کون ہے جو مجھ سے مغفرت طلب کرے اور میں اسے بخش دوں؟ (مسند احمد، مسند ابی ھریرہ حدیث نمبر ۹۵۹۱)

صدقہ وخیرات

یہ مہینہ غمخواری کا ہے، لوگوں کی ضرورت پوری کرنے کا مہینہ ہے؛ اس لیے اس ماہ میں صدقہ وخیرات کا اہتمام کرنا چاہیے، اللہ تعالی کی رضا کے لیے فقراء ومساکین، یتامی و بیوگان اور معاشرے کے معذور و بے سہارا افراد کی ضروریات پوری کرنا، ان کی خبر گیری کرنا، جن کے پاس لباس نہیں ہے انہیں کپڑے پہنانا، بھوکوں کو غلہ فراہم کرنا، بیماروں کا علاج و معالجہ، یتیموں، بیواؤں کی سرپرستی، اور معذوروں کا سہارا بننا، مقروضوں کے قرض کے بوجھ کو ہلکا کرنا اسی طرح ہر ضرورت مند کے ساتھ اظہار ہمدردی وغمخواری کرنا ان کی مدد کرنا، اس مہینہ میں بڑے اجر وثواب کا کام ہے، ابن عباس کی حدیث ہے کہ آپ ﷺ بھلائی کے کاموں میں سب سے زیادہ سخاوت کرنے والے تھے اور آپ کی سب سے زیادہ سخاوت رمضان کے مہینہ میں ہوتی تھی (مسلم، باب کان النبی اجود الناس، حدیث نمبر، ۲۳۰۸) سلف صالحین میں اس مہینہ میں کھانا کھلانے کا ذوق وجذبہ بڑا عام تھا اور یہ سلسلہ بھوکوں اور تنگ دستوں کو ہی کھلانے تک محدود نہیں تھا، بلکہ دوست واحباب اور نیک لوگوں کی بھی دعوت کرنے کا شوق فراواں تھا؛ اس لیے کہ اس سے پیار ومحبت اور الفت ومودت میں اضافہ ہوتا ہے اور نیک لوگوں کی دعائیں حاصل ہوتی ہیں، جن سے گھروں میں خیر وبرکت کا نزول ہوتا ہے، غریبوں کی دعائیں اور ان کی محبتیں قلب وجگر کو سکون واطمنان بہم پہنچاتی ہیں۔ اسی صدقہ اور اطعام طعام میں روزہ داروں کو افطار کرانا بھی داخل ہے جس کی حدیث میں بڑی فضیلت آئی ہے، کام بہت آسان ہے لیکن ثواب عظیم ہے اپنے گھر میں جو افطار تیار کیا جاتا ہے اگر اس میں ایک دو غریب کو شامل کرلیا جائے تو افطار میں کوئی کمی نہیں ہوگی لیکن روزہ رکھنے کے ثواب کے برابر ثواب ملتا ہے اور روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوتی ہے۔

اعتکاف

رمضان المبارک کا ایک اہم عمل اعتکاف ہے، آپ ﷺ اس کا بہت زیادہ اہتمام فرماتے تھے، رمضان کے اخیر عشرے میں آپ معتکف ہوجاتے تھے اور دنیوی معاملات اور تعلقات سے بالکل علحدہ ہوجاتے تھے، جس سال آپ ﷺ کا وصال ہوا اس سال آپ نے بیس دن کا اعتکاف کیا، رمضان کے اخیر عشرے میں اعتکاف سنت مؤکدہ علی الکفایہ ہے، اگر کوئی بھی نہ کرے تو پوری بستی کے لوگ سنت مؤکدہ کے تارک اور گنہگار ہوں گے، اعتکاف کی حالت میں انسان اللہ تعالی کے دربار میں ہر وقت حاضر رہتا ہے، نمازیں پڑھتا ہے، ذکر واذکار میں مشغول رہتا ہے، اللہ کے حضور دعاؤں میں گریہ وزاری کرتا ہے، اپنے رب کو منانے کی کوشش کرتا ہے، اپنی آخرت کی کامیابی کا خواستگار ہوتا ہے؛ یہ سب اعمال عبادت ہیں اس لیے اعتکاف مجموعہ عبادات ہے، معتکف تمام گناہوں سے محفوظ رہتا ہے اور جو نیک کام معتکف اعتکاف کی وجہ سے نہیں کرسکتا ہے اس کو اس نیک کام کا بھی ثواب ملتا ہے، رمضان کے اخیر عشرہ میں اعتکاف کرنا رب کو منانے کا بہترین ذریعہ ہے اس لیے آخری عشرے کے اعتکاف کا اہتمام ہونا چاہیے، اعتکاف کا سب سے بڑا فائدہ شب قدر کا پانا ہے، لیکن ہوتا یہ ہے کہ آخری عشرے کو غفلت وسستی اور عید کی تیاری میں گزار دیا جاتا ہے یہ کتنی محرومی اور بدنصیبی کی بات ہے کہ جس مبارک مہینہ کو پانے کے لیے آپ ﷺ دعا کیا کرتے تھے ان مبارک ایام کو ہم کس طرح غفلت وکوتاہی میں گزار دیتے ہیں، اللہ تعالی ہمیں اس کی قدر کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔

الحاج ڈاکٹر عبدالرؤف
ڈائرکٹر دانش گاہ اسلامیہ ہائی اسکول، آسنسول (بنگال)

امن کا فرشتہ مولانا امداداللہ رشیدی

مغربی بنگال کی پُر امن فضا میں زہر گھولنے کا کام گذشتہ چار سالوں سے بی جے پی نے جاری کر رکھا ہے جس کا اثر بنگلہ زبان بولنے والوں میں کچھ کم لیکن ہندی زبان بولنے والوں پر زیادہ پڑا ہے۔ کولکاتا کے بعد شہر آسنسول میں مسلمان پُر امن و پرسکون زندگی گذار رہے ہیں۔ معاشی طور پر تقریباً مستحکم اور تعلیمی طور پر اپنی نسلوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ اس علاقے میں اردو میڈیم پرائمری اسکول و ہائی اسکول کی تعداد زیادہ ہے کالجز اور
یونیورسٹی کی سطح تک بچوں اور بچیوں کو علم سے آراستہ و پیراستہ کرنے کا رجحان بھی مسلمانوں میں بہت زیادہ پروان چڑھا ہے اور عملاً اسکی کوششیں بھی جاری ہیں۔

سیاسی طور پر بھی ان میں بالیدگی ہے۔ حالات و وقت کے مطابق ووٹوں کا استعمال بھی کرتے ہیں۔

لیکن گذشتہ 2014 کے پارلیمانی الکشن میں بی جے پی کے بابل سپریو محض 37.14 فیصد ووٹ حاصل کر کے منتخب ہوئے جو بنگلہ زبان اور اردو زبان بولنے والوں کے ووٹوں کی تقسیم کا نتیجہ تھا۔ اس وقت سے ہی شہر میں ہندوتوا کا زور بڑھا ہے۔

اب آئندہ 2019ء کا الکشن بی جے پی کے سامنے ہے اور سابقہ فارمولہ پر عمل کرتے ہوئے مذہب کی سیاست کو اُبھارنا ان کا عین مقصد ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رام نومی، ہنومان جینتی، گنیش جینتی جیسا تہوار آسنسول میں عام ہو رہا ہے۔ جب کہ گذشتہ چھ سات قبل ایسا کوئی تہوار کا زور نہیں تھا۔ لیکن بی جے پی کی ایجنڈوں میں سرفہرست مذہبی منافرت و عصبیت پھیلانا شامل ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو کمزور کرنے کا آر ایس ایس فارمولہ اس کے رگ و پے میں سمایا ہوا ہے۔ جس کا نتیجہ 26/ مارچ کو آسنسول سے متصل رانی گنج میں رام نومی کا جلوس مسلم علاقہ سے داخل ہوا جس میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو نقصان پہنچاتے ہوئے مذہب اسلام کے پیشوا کے خلاف گستاخانہ گیت و گانے اور جذبات کو اشتعال دلانے والے نعرے لگائے جانے پر دوسرے فرقہ کے لوگوں نے اعتراض کیا اور اس نفرت آمیز نعرہ لگانے سے منع کیا لیکن رام نومی کے جلوس میں شامل ہجوم نے ماننے سے انکار کر دیا۔ بلکہ یہ ہجوم پتھر بازی، آتش زنی پر اُتر آیا اور فساد شہر میں پھیل گیا۔ جس سے ایک انسان کی موت اور ایک ڈی۔ ایس۔ پی کا داہنا ہاتھ ضائع ہو گیا اور وہ زندگی بھر کے لئے اپاہج ہو گئے۔ ابھی یہ آگ ٹھنڈی نہ ہونے پائی تھی کہ 27/ مارچ سے آسنسول میں رام نومی کا جلوس معہ ہتھیار نکال کر شہر کی پُر امن فضا کو بگاڑ کر مذہبی عصبیت پھیلانے میں وہ کامیاب ہو گئی اور شہر آسنسول میں بھی پتھر بازی اور آتشزنی، لوٹ مار و قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نورانی مسجد کے پیش امام مولانا امداد اللہ رشیدی صاحب کا 16/ سالہ لختِ جگر صبغۃ اللہ رشیدی جو کہ اپنے مدرسہ کے قریب کھڑا تھا۔ ان شر پسندوں نے انھیں کسی طرح اپنے نرغے میں لے لیا اور یرغمال بنا کر بہت ہی بے دردی و بے رحمی سے شہید کر دیا۔ حالانکہ یہ معصوم و بے قصور بچہ امسال 12/ مارچ 2018ء کو مدھیامک بورڈ کا امتحان دیا تھا اور امسال ہی مدرسہ حسینیہ سے حفظ و تجوید مکمل کیا تھا۔ اور 11/ اپریل کو اس معصوم شہید کی دستار بندی ہونے والی تھی۔

بچے کی شہادت سے آسنسول کی پُر امن فضا مکدر ہو گئی دونوں جانب سے افراتفری کا ماحول پیدا ہوا۔ بے قصور غریب عوام وشہری خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان سبھی متاثر ہوئے۔

24/ گھنٹہ گذرنے کے بعد 28/ مارچ کو پولیس نے ان شر پسندوں کے علاقہ سے بچہ کی لاش برآمد کی۔ جسے پولیس نے 29/ مارچ کو پوسٹ مارٹم کرنے کے بعد ان کے والد مولانا امداداللہ رشیدی صاحب کے حوالہ کر دیا۔

یہ ایک زبردست المیہ ہے کہ اللہ کسی ضعیف باپ کے کندھے پر جوان بیٹے کی لاش نہ دکھائے اسی روز ڈھائی بجے دن اس معصوم شہید کی نماز جنازہ ادا کی گئی جس میں تقریباً 5/ ہزار افراد اس غم واندوہ کے عالم میں شریک ہوئے اور اللہ کے حکم کے مطابق سپرد خاک کر دیا۔ انّا للّٰله و انّا اليه راجعون

مولانا امداد اللہ رشیدی صاحب اپنے معصوم شہید بیٹے کی لاش اور تدفین کے عمل کو دیکھ کر صبر وشکر کے پیکر بنے رہے۔ جبکہ وہاں موجود نوجوانوں کا جمّ غفیر، غیض وغضب اور جوش وانتقام کی آگ سے دہک رہا تھا ان کے وجود میں ایک لاوا ابل رہا تھا جو کہ کسی بھی لمحہ آتش فشاں بن کر پھٹ سکتا تھا لیکن مولانا امداداللہ رشیدی صاحب نے اس وقت جو کلمات ادا کئے وہ اس دہکتی ہوئی آگ میں برف کا کام کیا اور بپھرے ہوئے ازدہام کے انتقامی آگ کو سرد کر دیا۔

انہوں نے فرمایا کہ زندگی وموت کا مالک اللہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میرے بیٹے کی عمر اتنی ہی عطا کی تھی میں اپنے بیٹے کی شہادت پر کسی سے بھی انتقام نہیں لینا چاہتا ہوں۔ بلکہ میرے بیٹے کی جان کے بدلے شہر میں امن وامان چاہتا ہوں۔ شہر میں شانتی ہو، عوام الناس حسب سابق یکجہتی کی زندگی گذاریں۔

انہوں نے فرمایا کہ اگر انتقام لینے کی کوشش کی گئی تو میں امامت سے دستبردار ہو کر اس شہر کو بھی چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ میں نے اپنے سارے معاملات اللہ کے حوالہ کر دیا ہے۔

مولانا صاحب نے اس وقت شہر کے سرکاری عملہ، پولیس کا دستہ، سیاسی رہنما، پرنٹ میڈیا والکٹرونک میڈیا کے رپورٹر ونمائندہ کے سامنے اپنے جس جذبات کا اظہار فرمایا وہ ایک مومن کی پہچان ہے جو اللہ کے فیصلہ کے سامنے سرخم کر لے۔

اسی دوران اسمبلی حلقہ کے ایم۔ال۔اے (M.L.A.) اور ریاستی وزیر قانون شری مولائے گھٹک نے مولانا صاحب کو اس حادثہ کے عوض اپنے خاص فنڈ سے معاوضہ دینے کی پیشکش کی جسے مولانا صاحب نے یکلخت مسترد اور انکار کر دیا اور فرمایا کہ انہیں دنیا والوں سے کوئی معاوضہ نہیں چاہئے اس کا معاوضہ اللہ دے گا۔

قُلْ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ (پارہ۔سورہ انعام آیت نمبر ۱۶۲)

ترجمہ:۔ ''آپ ﷺ کہ دیجئے کہ بیشک میری نماز، میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے واسطے ہیں جو تمام جہانوں کے رب ہیں''۔

مولانا امداداللہ رشیدی صاحب نے اپنے بیٹے کی شہادت پر دنیائے انسانیت خاص طور سے ہندوستانی باشندوں کو اپنا پیغام دیا ہے جس سے اللہ کے دین کی اعلیٰ درجہ کی نمائندگی ہوئی اور دنیا کے سامنے یہ پیش کیا۔ کہ مومن کا کردار کیسا ہوتا ہے۔ مولانا صاحب زندگی اور موت کو اللہ کے اختیار میں سمجھتے ہیں اور ہر وقت راضی بہ رضا رہتے ہیں۔

مولانا صاحب کے اس صبر واستقامت کا صلہ اللہ تعالیٰ عطا فرمائیں گے کہ اپنی قوم کو فساد کی آگ میں مزید جھلسنے سے بچالیا۔ نہ جانے کتنے خاندان کو اس دکھ کا سامنا کرنا پڑتا کتنے گھروں میں آگ لگ جاتی کتنی ہی ہلاکتیں ہوتیں۔

اس امن وآشتی کی خبر کو اردو اخبارات کے علاوہ بنگلہ، انگریزی، ہندی، کنڑ، ملیالم، تیلگو اخبارات نے شائع کیا اور امن وآشتی کے اس مرد مومن کا اسلامی کردار بلند ہوا کہ کس طرح اپنے جوان بیٹے کی موت کو شہر کے امن وامان کا نذرانہ

قرار دینے کی اپیل کی جیسے اقوام عالم نے سراہا۔ بالخصوص 3اپریل دی انڈین ایکسپریس میں ملیالم زبان کے ایک بہت بڑے مصنف ایس گوپال کرشنن نے درج تحریر فرمایا اور مہاتما گاندھی سے موازنہ کیا مضمون کا عنوان ہے A "Mahatma in An Imam" (امام کی سیرت و کردار میں ایک مہاتما)

گوپال کرشنن نے یہ بات مہاتما گاندھی جی کے حوالے سے کہی ہے اگر انہیں آنحضرت محمد ﷺ کی سیرت و زندگی کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہوتا تو شاید وہ مہاتما گاندھی کے بجائے حضرت محمد ﷺ کے سیرت و کردار کی ایک جھلک کہتے۔ امام صاحب سے کسی نامہ نگار نے سوال کیا کہ آپ کے اندر ایسا اعلیٰ وارفع کردار کیسے آیا۔ امام صاحب نے برجستہ کہا ۔ یہ ہمارے نبی ﷺ کی تعلیم ہے جس کا ایک معمولی عنفر میرے کردار میں آپ کو نظر آرہا ہے۔ گوپال کرشنن نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ آسنسول کے نواکھالی (بنگلہ دیش) سے 562 کیلومیٹر دوری پر واقع ہے دونوں مقامات پر ایسے تاریخی واقعات رونما ہوئے ہیں اگر پہلے واقعہ کا ذہن میں ہو تو آسنسول میں جو کچھ ہوا یا جو امام صاحب نے کیا کہا ہے پہلے واقعہ کی یاد تازہ ہوجائے گی۔ آج آسنسول میں وہی واقعہ دہرایا گیا ہے جو 70 سال پہلے نواکھالی میں رونما ہوا تھا۔

مزید گوپال کرشنن لکھتے ہیں مولانا امام رشیدی صاحب نے اپنے سولہ سال کے بیٹے کو رام نومی کے حالیہ پر تشدد جلوس کی وجہ سے کھو دیا۔ اس موقع پر مغموم و مظلوم اور امام کے ارد گرد سینکڑوں لوگ غم و غصہ کے ساتھ جمع تھے۔ مولانا موصوف نے تقریباً اسی قسم کی باتیں کہیں جو گاندھی جی نے 1946 میں کی تھیں۔ ''میں اپنے بیٹے کو کھو دیا میں اسے تسلیم کرتا ہوں لیکن اگر کوئی شخص کسی پر بدلے کیلئے ایک انگلی بھی اُٹھاتا ہے تو میں اس مسجد اور اس شہر کو چھوڑ دوں گا۔

اسی طرح سوشل میڈیا کے تمام ذرائع مولانا صاحب کے صبر و تحمل، انسانی ہمدردی، امن و شانتی اور قومی یکجہتی کو پوری دنیا میں وائرل کر دیا ہے۔

غرضیکہ آج کے پیدا شدہ حالات اور اس کا پس منظر یہی ہے کہ ملک میں جتنے بھی فسادات ہو رہے ہیں اس کا مقصد صرف مسلمانوں کو معاشی طور پر بدحال کر دیا جائے اُنہیں کاسہ گدائی پکڑایا جائے اُن کے بچوں کو ان پڑھ رکھا جائے اور اخیر میں سبھوں کا شدھی کرن کر دیا جائے۔ اس لئے ہمیں ان سازشوں سے ہوشیار رہنا ہے۔ یہ عناصر اشتعال پھیلائیں گے لیکن ہمیں کبھی بھی مشتعل نہیں ہونا ہے۔

بلکہ نہایت سنجیدگی و دانشمندی اور تدبّر سے حالات کا مقابلہ کرنا ہے۔ اشتعال کو ڈیفوز (Defuse) کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ No reaction۔

جس کا کہ مولانا امداد اللہ رشیدی صاحب نے اپنے جوان بیٹے کے کھونے کے بعد اظہار فرمایا ہے۔ یقیناً یہ امن کے پیغامبر اور فرشتہ صفت ہیں۔ جسے دنیائے انسانیت نے نہایت ہی قدر کی نگاہوں سے دیکھا ہے اور امن انسانیت کے اس پیکر کو نذرانہ سلام پیش کیا ہے۔

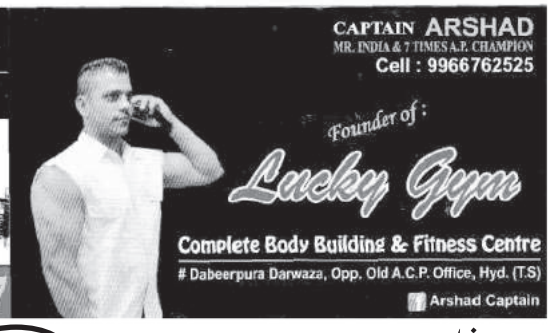

مولانا عبدالمنان مظہر

سحری (مفہوم اہمیت، آداب)

مفہوم: سحری ،سحر سے ہے اور سحر کے معنی صبح سویرے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ سحری اس کھانے کو کہتے ہیں جو صبح سویرے کھایا جائے۔ عربی میں اسے سحور کہا جاتا ہے۔ اصطلاح میں سحری اس کھانے کو کہتے ہیں جو روزہ رکھنے کے لیے صبح صادق کے وقت فجر کا وقت شروع ہونے سے پہلے تک کھایا جاتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ رات دیر گئے کھا کے سوجانا اور اسے سحری سمجھ لینا درست نہیں ہے، بلکہ سحری مسنون وہ ہے جو صبح صادق کے وقت کھائی جائے۔

اہمیت: سحری کھانا نبی کریمؐ کی وہ عظیم سنت ہے جسے آپؐ نے اہل اسلام اور اہل کتاب کے درمیان فرق کرنے والی چیز بتایا ہے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ سے مروی ہے کہ ''نبی کریمؐ فرمایا کہ ہمارے روزے اور اہل کتاب کے روزے کے درمیان سحری کھانے کا فرق ہے''۔ (صحیح مسلم:2550)

سحری کھانا باعث برکت ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے۔ کہتے ہیں کہ پیارے نبیؐ نے ارشاد فرمایا:

''سحری کھاؤ کہ سحری میں برکت ہے''۔ (صحیح بخاری:1923)

ایک دوسری روایت میں پیارے نبیؐ نے اسے مبارک کھانا کہا ہے۔ حضرت عرباض بن ساریہؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگوں کو پیارے نبیؐ نے رمضان میں سحری کھانے کے لیے بلایا اور کہا ''آؤ برکت غذا پر''۔ (سنن ابی داؤد:2344)

اس حدیث میں جہاں آپ سحری کو بابرکت کہا وہیں اس کے لیے غذا کا لفظ استعمال کیا جس کے اصل معنی دوپہر کے کھانے (Lunch) کے آتے ہیں جس سے یہ بات بھی نکل کر آتی ہے کہ سحری آخری صبح صادق میں کرنا چاہئے۔ درجہ بالا روایت سے سحری کی اہمیت وحیثیت بہت نمایاں طور پر واضح ہوتی ہے۔ چنانچہ صحابہ اسے فلاح یعنی کامیابی کے حیثیت سے بھی یاد کرتے تھے۔ جیسا کہ ترمذی کی ایک لمبی ہے جس میں حضرت ابوذرؓ نے پیارے نبیؐ کے قیام اللیل کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کیا ہے پیارے نبیؐ نے ہمیں نماز پڑھائی اور اتنا لمبا قیام کیا کہ ہمیں فلاح (سحری) کے چھوٹ جانے کا اندیشہ ہوا۔ (ترمذی:806)

لہذا مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ سحری لازما کیا کریں۔ اگر رات کا کھانا زیادہ ہوگیا ہے اور خواہش نہیں ہے تو چند لقمے ہی سہی سنت کی نیت سے نوش کرلیں۔ یا پھر چند کھجوریں ہی لے لیں تاکہ اس بابرکت کھانے اور عظیم عبادت سے محروم نہ رہیں۔ کھجور پیارے نبیؐ کی محبوب غذا ہے جسے آپؐ سحری میں بھی لینا پسند کرتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ پیارے نبیؐ نے ارشاد فرمایا ''کھجوریں مومن کی کتنی اچھی سحری ہے۔ (سنن ابی داؤد: 2345)

آداب: سحری آخری وقت میں کرنا افضل اور بہتر ہے۔ پیارے نبیؐ کا فرمان ہے کہ ہم گروہ انبیاء کو حکم دیا گیا ہے کہ ہم سحری تاخیر سے اور افطار جلدی سے کریں''۔ (ابن جان، صحیح:1770)

جب کہ ایک دوسری روایت میں نبی کریمؐ کا ارشاد ہے کہ میری امت جب تک سحری کرنے میں تاخیر اور افطار میں جلدی کرے گی، خیر پر رہے گی۔ (مسند احمد، ص:172)

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے ہم سے کہا کہ ہم نے نبی کریمؐ کے ساتھ سحری کی پھر آپ کے ساتھ نماز فجر ادا کی۔ پوچھا گیا سحری اور نماز دونوں کے درمیان وقفہ کتنا تھا۔ حضرت زیدؓ نے جواب دیا پچاس آیات

تلاوت کرنے کے بقدر۔(جامع ترمذی:703)

ظاہر ہے اسی وقفے میں اذان ہوئی ہوگی۔ضرورت مندوں نے وضو کیا ہوگا اور سنت پڑھی گئی ہوگی۔ پھر جماعت قائم ہوئی ہوگی۔اس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ بالکل آخری وقت میں سحری کی ہوگی۔حضرت سہل بن سعدؓ کی ایک روایت اس سلسلے میں مزید وضاحت پیش کرتی ہے۔آپؓ فرماتے ہیں کہ میں اپنے گھر پر سحری کرتا، پھر نبی کریمؐ کے ساتھ نماز فجر پانے کے لیے مجھے جلدی کرنی پڑتی تھی۔(بخاری:577)

آج کل اس سلسلے میں بڑی غفلت برتی جارہی ہے۔ عموماً رمضان کے کلینڈر پر دس منٹ احتیاط کے ساتھ چھاپے جاتے ہیں اور عوام اس میں مزید پانچ دس منٹ احتیاط کر لیتی ہے۔ اب تو مزاج یہ بن رہا ہے کہ جلدی سحری سے فارغ ہوکر مسجد چلے جاتے ہیں اور اذکار وتلاوت میں مشغول ہوجاتے ہیں۔ یہ طریقہ خلاف سنت ہے۔ ہونا یہ چاہئے کہ پہلے نوافل اور اذکار وتلاوت سے فارغ ہولیں پھر سحری کریں اور جاکر نماز فجر ادا کریں۔

سحری ایک عبادت ہے۔اس کی بہت ساری برکتوں میں ایک برکت یہ بھی ہے کہ اس دن کے اوقات میں عبادات کی ادائیگی میں تقویت حاصل ہوتی ہے۔اگر سحری نہ کی جائے تو انسان بھوک پیاس سے نڈھال ہوسکتا ہے اور عبادات کی ادائیگی اس پر شاق ہوسکتی ہے۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ خوب پیٹ بھر بھر کر کھایا جائے، سانسیں لے کر پانی پیا جائے اور پھر حال یہ کو کہ دوپہر تک ڈکاریں آتی رہیں اور دیر تک یہ ہضم ہوتب تک انواع واقسام کے کھانوں اور مشروبات سے سجا دسترخوانِ افطار سامنے ہو۔اس سے طبیعت اور بوجھل ہوجائے گی اور نیند کا غلبہ ہوجائے گا۔سحری کے ساتھ اس طرح انصاف کرنا، قرین انصاف نہیں ہے۔یاد رکھنا چاہئے کہ رمضان کو بیشتر مواسات یعنی ہمدردی وغمخواری کا مہینہ کہا گیا ہے۔

انسان جب خود بھوکا ہوتا ہے تو اسے دوسروں کی بھوک پیاس کا احساس ہوتا ہے اور وہ پھر لوگوں کی بھوک پیاس کو ختم کرنے کے لیے اپنی کوشش کرتا ہے۔صدقہ وخیرات کرتا ہے، غریبوں سے پیار کرتا ہے اور سماج میں غریبوں سے ہمدردی اور غمخواری کی ایک لہر چل پڑتی ہے۔اس لیے ضروری ہے کہ سحری کو ناشتے کی شکل تک محدود رکھا جائے۔اسے بھرپور کھانے کی شکل دے کر اس کی روح کو زخمی نہ کیا جائے۔البتہ سحری روز کی جائے۔کیوں کہ پیارے نبیؐ صوم وصال یعنی بلاسحری وافطار کے مسلسل روزے رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریمؐ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ ’’آپ نے فرمایا مسلسل (بلاسحری وافطار) کے روزے نہ رکھو۔ہاں اگر کوئی ایسا کرنا ہی چاہے تو وہ سحری کے وقت ایک ایسا کرسکتا ہے (یعنی رات بھر بھوکے رہ سکتے ہو مگر سحری کے وقت کھا پی لیا کرو)۔صحابہ کرامؓ نے عرض کیا، یارسول اللہ! آپؐ تو ایسا کرتے ہیں۔اس پر آپ نے فرمایا میں تمہاری طرح نہیں ہوں۔ میں تو رات اس طرح گزارتا ہوں کہ ایک کھلانے والا مجھے کھلاتا ہے اور ایک پلانے والا مجھے پلاتا ہے۔(صحیح بخاری:1963)

بعض حضرات ایسی بھی بے احتیاطی کرتے ہیں کہ بالکل آخر وقت میں بستر سے اٹھتے ہیں اور ابھی سحری مکمل بھی نہیں کر پاتے کہ اذان ہونے لگتی ہے۔اس سلسلے میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ سحری کا وقت متعین صبح صادق تک ہے اور اس کے بعد کھانے پینے والا کا روزہ نہیں ہوگا اور اذان فجر سحری کا وقت شروع ہوگیا ہے تو خواہ اذان شروع نہ ہوئی ہو۔ اب کچھ بھی کھایا پیا نہیں جاسکتا۔بصورت دیگر روزہ نہیں ہوگا۔

مزید برکات: سحری کے لیے جب ایک شخص بیدار ہوتا تو احادیث کے مطابق یہ رات کا وہ پہر ہے جب اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر نازل ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ وقت بارگاہ اللہ رب العزت میں الحاوزاری اور مقبولیت دعا کا خاص الخاص وقت ہے۔ اللہ خود سوال کرتا ہے ’’ادعونی استجب لکم‘‘ (مجھے پکارو میں تمہیں بامراد کروں گا)۔سورۃ المومن 60

اس کی تشریح میں حضرت ابو ہریرہؓ کی وہ روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا: ''ہمارا بلند و برتر اور برکت والا رب ہر رات اس وقت آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے جب آخری تہائی حصہ رہ جاتا ہے اور کہتا ہے کوئی ہے مجھ سے دعا کرنے والا کہ میں اس کی دعا قبول کروں، کوئی مجھ سے مانگنے والا ہے کہ میں اسے دوں، ہے کوئی مجھ سے بخشش طلب کرنے والا کہ میں اسے بخش دوں''۔(بخاری 1145)

چنانچہ اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی ہر ممکن کوشش ہونی چاہئے۔ کچھ وقت پہلے ہی آدمی بیدار ہوجائے۔ اپنے رب سے التجائیں کرے، نماز تہجد پڑھے اور اپنی خطاؤں کی معافی طلب کرے، اپنی حاجات کو اس کے دربار میں قبولیت کے یقین کے ساتھ پیش کرے اور بامراد ہوجائے۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ پیارے نبیؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے سحری کرنے والوں پر رحمت بھیجتے ہیں (المعجم الاوسط الاعبرانی: 2166)

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ان اہل ایمان کی تعریف کی ہے جو بوقت سحر استغفار کرتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے والمستغفرین بالاسحار (اور جو سحر کے وقت اللہ سے مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے ہیں (آل عمران 17)

اس طرح ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا ''وہ رات کے وقت کم سوتے تھے اور سحری کے اوقات میں وہ استغفار کرتے تھے'' (سورۃ الزاریات 17,18)

درج بالا گزارشات سے سحری کی اہمیت وخصوصیات کا بخوبی علم ہوگیا ہوگا۔ ہمیں چاہئے کہ اس انتہائی بابرکت عبادت کو پوری طرح سے طریقہ نبویؐ پر ادا کریں اور اس کا بھرپور اخروی فائدہ حاصل کریں۔

شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد میں استقبالیہ اور ادبی پروگرام

ماہنامہ اطلاع عام کے مدیر اعلیٰ اور دانش گاہ اسلامیہ ہائی اسکول کے ڈائریکٹر الحاج ڈاکٹر عبد الرؤف کی حیدرآباد میں آمد پر ایک استقبالیہ اور ادبی پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر مختار احمد فردین نے الحاج عبدالرؤف کا آسنسول کے حوالے سے مکمل تعارف کرواتے ہوئے یہ کہا کہ آپ آسنسول کے سرسید احمد خان ہے جنہوں نے دانش گاہ اسلامیہ قائم کی اور جس میں ہزاروں بچے اردو میڈیم سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے دنیا کے کونے کونے میں علم کی روشنی پھیلا رہے ہیں۔ آپ کے خدمات صرف اتنا ہی نہیں بلکہ مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ کی جانب سے مانو کو دس ایکر زمین دے کر بی ایڈ کالج کا آغاز بھی باقاعدہ کرادیا گیا ہے اور آج سینکڑوں طلباء وطالبات اس علم کی روشنی سے فیض یاب ہورہے ہیں۔ ڈاکٹر محامد ہلال نے انہیں تہنیت پیش کی اور کولکتہ کی سماجی کارکن محمد شمیم کی بھی گلپوشی کی گئی۔ شبلی انٹرنیشنل کے لیے آج کا دن نہایت ہی اہم دن ہے ۔صدائے شبلی کے خصوصی شمارہ کی رسم رونمائی بھی الحاج عبدالرؤف کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس پروگرام میں ڈاکٹر عبدالقدوس نے ٹرسٹ کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ دو سال قبل چند نوجوانوں نے اس ٹرسٹ کی بنیاد رکھی، ٹرسٹ نے قلیل مدت میں ہی تعلیمی، سماجی اور ادبی خدمات انجام دی ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلا اجلاس حضرت رحمٰن جامی کی صدارت میں ہوا، جہاں اردو کی صورتحال کا جائزہ لینے کے ساتھ اردو کی خدمات انجام دینے کا عزم کیا گیا۔ ٹرسٹ کا دوسرا پروگرام اعظم گڑھ کی سرزمین پر قوت تعلیم انٹرنیشنل کانفرنس کے نام سے اعلیٰ پیمانے پر کیا گیا، جس میں ملکی اور غیر ملکی علماء، پروفیسرس، ڈاکٹرس اور ریسرچ اسکالروں نے تعلیم کے مختلف زاویوں سے تقریباً پچاس مقالے لکھے۔ ٹرسٹ کا تیسرا اجلاس اردو زبان وادب اور نئی نسل کے عنوان سے مغل پورہ حیدرآباد میں منعقد کیا گیا اور چوتھا اجلاس ایک شام شبلی کے نام سے اسی مقام پر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی ڈائریکٹر دارالمصنفین اعظم گڑھ کی صدارت میں ہوا۔ ٹرسٹ کے زیر انتظام شاہین نگر میں ایک مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم کی بنیاد رکھی گئی، جس میں نونہالانِ ملت زیورِ تعلیم سے آراستہ ہورہے ہیں۔ ٹرسٹ نے اپنی ایک ویب سائٹ بھی جاری کی ہے، جس میں مختلف کتابیں موجود ہیں۔ ٹرسٹ نے ایک رسالہ ''ماہنامہ صدائے شبلی'' جاری کیا ہے، جس میں دینی، تعلیمی، معاشرتی، ادبی، اور سائنسی مضامین شامل کیے جاتے ہیں۔ مذکورہ نشست میں ڈاکٹر حمران احمد، ابو ہریرہ یوسفی اور سید امام قادری، محمد شمیم (کولکتہ) نے مہمان کے روبرو اپنے تعارف کے ساتھ دیگر تعمیری باتیں کیں۔ ڈاکٹر عبدالرؤف نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ شبلی ایک تحریک کا نام ہے اور آپ جو شبلی کے نام سے منسوب مختلف خدمات سرانجام دے رہے ہیں، یہ تاریخ ساز ہے۔ شبلی کی تصانیف ایک صدی کے بعد آج بھی اہل علم پر انمٹ نقوش چھوڑ رہی ہے۔ بندہ ناچیز باامید ہے کہ ٹرسٹ کا رسالہ صدائے شبلی کے ذریعہ اردو زبان وادب اور سچی صحافت کو فروغ ملے گا۔

ڈاکٹر مصلح الدین سبیلی نظامی
کامل الفقہ جامعہ نظامیہ ایم فل۔ پی ایچ ڈی عثمانیہ

علم کی فضیلت واہمیت

انسان شیر کی طرح طاقتور نہیں، ہاتھی کی طرح عظیم نہیں چاند کی طرح بلد اور سمندر کی طرح گہرا نہیں لاسکتا لیکن یہ بات کس قدر عجیب ہے کہ ان میں سے کوئی چیزیں جس کو انسان کی عقل وبصیرت نے اپنا غلام نہ بنالیا ہو۔ **وسخر لکم ما فی السموات ومافی الارض جمیعا منہ انّ فی ذلک لآیات لقوم یتفکرون۔**

انسانیت کا سب سے بڑا امتیاز علم ہے۔ اللہ تعالی نے اس کے اندر چیزوں کو سمجھنے کی صلاحیت دی ہے کہ وہ چیزوں کو ناموں سے موسوم کر سکے۔ وعلم آدم الاسماء کلھا۔

سائنس کے یہ سارے کرشمے اور علم وفن کی یہ ساری ترقیاں دراصل اسی تسخیر کی زندہ شہادتیں ہیں۔ سارے علوم جن کا مقصد انسانیت کی خدمت اور ان کی فلاح ہیں۔ اسلام میں پسندیدہ ہیں اسی کو رسول اللہؐ نے حکمت سے تعبیر کیا ہے اور فرمایا کہ **الحکمۃ ضالۃ المؤمن**۔ کہ حکمت مومن کی گمشدہ چیز ہے اسی لئے بندہ مومن پہ لازم ہے کہ وہ اپنی گم شدہ شئے یعنی حکمت ودانائی کو تلاش کرے اور یہ علوم وفنون کے حصول کے بغیر ممکن نہیں۔ مسلمانوں نے بعد کے زمانے میں جو ترقیاں کی اور جس کے باعث وہ ساری دینا کے معلم بنے اور ساری دنیا کے لوگ عربی کتب کو پڑھ کر جدید ترین تحقیقات سے آگاہ ہوئے اس کی اساس ظاہر ہے عہد نبویؐ کی تیار کردہ ہوسکتی تھی۔

نبی امیؐ کو سب سے پہلا جو خدائی حکم ملتا ہے وہ یہ ہے کہ **اقرا باسم ربک الذی خلق خلق الانسان من علق اقرا وربک الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم**۔ اس میں رسول اللہؐ کو پڑھنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ پہلے جملے میں اللہ کی طرف سے ایک حکم آتا ہے اور پھر پڑھنے کی اہمیت بھی اسی وحی میں بیان کردی جاتی ہے یعنی یہ کہ قلم ہی وہ واسطہ ہے جو انسانی تہذیب وتمدن کا ضامن ہے، اسی ذریعہ سے انسان وہ چیزیں سیکھتا ہے جو اسے معلوم نہیں ہوتیں، انسانی علوم اور دیگر مخلوقات خاص کر جانوروں کے علم میں سب سے نمایاں فرق یہی ہے حیوانات کا علم محض علم ہوتا ہے اس لئے اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے آباواجداد کے تجربوں سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنے ذاتی تجربوں سے بھی اپنے علم میں اضافہ کرتے رہتے ہیں اور یہ سارا علم اپنی آئندہ نسلوں کو منتقل کر دیتے ہیں۔ الذی علم بالقلم۔ تخلیق انسانی کے بعد اس کی تعلیم کا بیان ہے کیونکہ تعلیم ہی وہ چیز ہے جو انسان کو دوسرے تمام حیوانات سے ممتاز اور تمام مخلوقات سے اشرف واعلی بناتی ہے۔ پہلی وحی میں آپ کو پڑھنے کا حکم دیا گیا، یہ بات ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ نبی امی کو پہلے ہی حکم میں اس طرف کیوں متوجہ کیا گیا پھر اس کے بعد تقریباً ۲۳ رسالہ عرصہ گزارا جس میں کم وبیش بیسیوں آیتیں ایسی ملتی ہیں جن میں علم کی فضیلت واہمیت کو کما حقہ واضح کیا گیا ہے۔ اس طرح ان آیات میں عجیب وغریب مناظر کا نقشہ بھی کھینچا گیا ہے۔ مثلاً کہیں یہ کہا جاتا ہے ارشاد ربانی **وما اوتیتم من العلم الا قلیل** ۔ تمہیں علم نہ دیا گیا مگر تھوڑا اور کہیں یہ کہا گیا۔ قل رب زدنی علما اور دعا کرو کہ اے رب مجھے علم زیادہ دے۔ اسی طرح یہ ضرب المثل بھی بہت خوب ہے **اطلبو العلم من المھد الی اللحد**۔ گہوارے سے قبر تک یعنی پیدا ہونے سے موت تک علم حاصل کرتے رہو۔

جنگ بدر کے قیدیوں سے رسول اللہؐ نے مسلمانوں کو

لکھنا پڑھنا سکھانے کا کام لیا تھا اس واقعہ کو ایک محدث نے اس طرح ذکر کیا ہے کہ کسی مشرک کو مسلمانوں کی تعلیم کے لئے استاذ بنانے کا جواز ہے کیونکہ مکہ والے مشرک اور کافر تھے اور مسلمان بچوں کی تعلیم کے لیے بدر کے مشرک قیدیوں کا انتخاب کیا گیا تھا۔

مدینہ پہنچنے کے بعد سب سے پہلے آپؐ نے ایک عبادت گاہ کی تعمیر کا کام کیا چنانچہ جب قبا میں پہنچے تو وہاں پہ ایک مسجد تعمیر کروائی جب قبا سے بنونجار کے علاقے میں تشریف لائے تو وہاں یہ بھی آپؐ نے ایک مسجد بنوائی یہی وہ مسجد نبوی ہے جس کا ایک حصہ تعلیم گاہ کے طور پر مخصوص کر دیا گیا جس کو ہم صفہ کے نام سے جانتے ہیں جس کا معنی ہے پلیٹ فارم یا بلند مقام کو کہتے ہیں مسجد نبوی کی تعلیم گاہ کا حصہ اس غرض کے لیے مخصوص کر دیا گیا کہ دن کو درسگاہ کا کام دے اور رات ان لوگوں کے لیے جن کا کوئی گھر نہیں ہے سونے کا کام دے۔ وہاں پہ طلباء کے لیے تعلیم کا بھی انتظام تھا اور رہنے کا بھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ صفہ میں دو قسم کے طلباء ہوتے تھے ایک وہ جو تعلیم حاصل کر کے اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے تھے اور دوسرے وہ جو تعلیم حاصل کرنے کے بعد گھر نہ ہونے کی وجہ سے وہیں قیام پذیر ہوتے تھے۔

تعلیم کی فضیلت واہمیت کا اندازہ اس حدیث سے بخوبی عیاں ہوتا ہے کہ ایک دن رسالت مآبؐ اپنے حجرۂ مبارک سے باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ دو گروہ مسجد نبوی میں ہیں ایک گروہ تسبیح وتہلیل میں مشغول ہے اور دوسرا گروہ تعلیم وتعلم میں یعنی علم کے سیکھنے سکھانے میں آپؐ نے فرمایا کہ اگرچہ دونوں گروہ قابل تحسین ہیں لیکن وہ گروہ بہتر ہے جو تعلیم حاصل کر رہا ہے پھر آپؐ بھی اس گروہ میں شامل ہو گئے اس لیے آپؐ کا ارشاد ہے **خیر کم من تعلم القرآن وعلمه** تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن کو خود بھی سیکھے اور دوسروں کو بھی سکھائے۔

بہر حال ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ قرآن مجید میں مختلف علوم ہیں اس میں تاریخ کا بھی ذکر ہے، اس میں سائنس کا بھی ذکر ہے۔ مثلاً علم نباتات، علم ہیئت، اور ٹکنالوجی یہاں تک کہ علم جنس کا ذکر ملتا ہے۔ قرآن مجید میں علم جنس کی اتنی مفصل تشریحات آئی ہیں کہ ان کا اس جدید ترین دور تک بھی احساس ہو رہا ہے کچھ عرصہ قبل پیرس میں ایک کتاب Bible Quran Seincle آئی ہے جو ایک مشہور سرجن دیکائی کی تصنیف ہے۔ دیکائی کو بچوں کی ولادت کے علم سے دلچسپی ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ علم جنین کے متعلق جو تفصیلات قرآن مجید نے دی ہیں ان کا علم یونان کے مشہور قدیم اطباء کو تھا اور نہ زمانہ حال یورپی لوگوں کو ہے جنہوں نے سالہا سال تک اس موضوع پر ریسرچ کی لیکن اب سے چودہ سو سال قبل ایک بدوی اس کا ذکر کرتا ہے تو یقیناً یہ انسان کا کلام نہیں ہونا چاہئے، قرآن کی اس بات سے متاثر ہو کر دیکائی نے اپنے مسلمان ہونے کا بھی اعلان کر دیا اسی طرح قرآن مجید میں بیالوجی کا ذکر بھی ملتا حیوانات اور موتیوں کا بھی تفصیلی ذکر ملتا ہے۔

قرآن مجید کی مذکورہ بالا تشریحات اس بات کی متقاضی ہیں کہ مسلمان جو وحی الٰہی کے علم بردار ہیں اگر انہیں وحی ربانی کی حفاظت کرنی ہے اور مسلمانان عالم کو ذلت ورسوائی کے دلدل سے نکالنا ہے تو انہیں سائنس وٹکنالوجی کے میدان میں قدم بڑھانا ہوگا۔ مختلف علوم وفنون میں مہارت پیدا کرنی ہوگی۔ قرآن کریم کی ان آیات پہ عمل پیرا ہونا ضروری ہے جہاں تسبیح وتہلیل اور ذکر واذکار کے ساتھ کائنات کی بناوٹ میں غور وفکر اور تدبر کی دعوت دی گئی ہے **الذین یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلی جنوبھم ویتفکرون فی خلق السموات والارض**۔ آج ہم قرآن مجید کے صرف ایک پہلو پر نظر ڈالتے ہیں اور دوسرے جزو تدبر وتفکر کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ علوم وفنون میں مہارت کی ترغیب بھی حضورؐ کے اس قول سے عیاں ہوتی ہے کہ آپؐ ایک مرتبہ ایک صحابی کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور پوچھا کہ تمہارے محلے یا قبیلے میں کوئی طبیب ہے؟ جواب میں دو نام بتائے گئے۔ آپؐ نے فرمایا ان دونوں میں جو ماہر تر ہو اس کو بلاؤ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے اس بات بھی خیال رکھا

کہ Specialisalie پیدا کریں اور ماہروں سے علاج کرائیں۔اس سے لوگوں کو ماہر بننے کی ترغیب بھی ملتی ہے۔

مسلمانان عالم کا علوم میں انحطاط دیکھ کر مجھے یہ شعر یاد آرہا ہے جسے پڑھ کر شاید قوم مسلم کے رگوں میں پھر کچھ حرارت پیدا ہوجائے ؎

گنوادی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمین پر آسماں نے ہم کو دے مارا

حوالے

(۱)القرآن سورۃ الجاثیۃ آیت:۱۳

(۲)القرآن سورۃ العلق آیت:۱

(۳)اسلامی ریاست، ڈاکٹر حمید اللہؒ باب پنجم، ص:۱۱۰۔فرید بک ڈپو دہلی

(۴)اسلامی ریاست، ڈاکٹر حمید اللہؒ باب پنجم، ص:۱۱۲۶۔فرید بک ڈپو دہلی

(۵)معارف القرآن، مفتی محمد شفیعؒ، جلد ہشتم، ص:۷۸۵۔ربانی بک ڈپو دہلی

احمد نور عینی۔ریسرچ اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

اے بلبلو! پھر پیار کا نغمہ چلو گائیں

پیارے ہندوستان کے موجودہ حالات کے پسِ منظر میں
خاص کر ذات و مذہب سے پرے اٹھ کر جو کینڈل مارچ نکالا جارہا ہے اس سے متاثر ہوکر

بھارت کی جو ہے قوم، ابھی سوئی نہیں ہے
آپس کی محبت بھی ابھی کھوئی نہیں ہے

مسلم ہو کہ عیسائی ہو، ہندو ہو کہ سکھ ہو
خوں سب کا ہے اک، خوں کا دھرم کوئی نہیں

'اُنّاؤ' کی گھٹنا ہو کہ 'کٹھوا' کا ستم ہو
ممکن نہیں سینے میں ہو دل، پھر بھی نہ غم ہو

ایک پھول سی بچی تھی وہ، نو عمر تھی نو خیز
ماں باپ کا ارماں تھی وہ، گھر اس سے تھا گل بیز

منقار ہوس اس پہ کمینوں نے کیا تیز
ہے سب کو پتہ کس کا ہے یہ غمزہ؟ خوں ریز

ظالم کا گھمنڈ جلد ہی ٹوٹے گا، یقیں ہے
مالک کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے

اُنّاؤ کا وہ قتل بھی ہے کتنا شرمناک
انصاف کا خواہاں تھا جو باپ، اس کو ملی خاک

پہلے تو کیا اک لڑکی کی عصمت کی قبا چاک
پھر باپ کی جاں لے کے سکوں پایا وہ سفاک

ایوان کی کرسیکا سہارا نہ چلے گا
تو آتش جاوید کی سوزش میں جلے گا

کچھ امن کے دشمن ہیں، عجب ان کا ہے بیوپار
کرتے ہیں ہر اک سمت میں نفرت کا ہی پرچار

ہندو کو مسلماں سے لڑانے کو ہیں تیار
ہم ہندی تو اس جال میں ہوں گے نہ گرفتار

اس دیش میں ہم پیار کا پرچار کریں گے
دشمن کو بھی ہم پیار سے ہی یار کریں گے

اس باغ کی سینچائی میں ہے سب کا خوں شامل
انگریزوں سے آزادی بھی مل جل کے کی حاصل

دستور بھی ہے مذہبی آزادی کا قائل
پر اب وہ ہیں حالات کہ گریاں ہے بہت دل

اے بلبلو! پھر پیار کا نغمہ چلو گائیں
گلشن سے جو روٹھی ہے بہار اس کو لے آئیں

بشیرانساء
پی۔ایچ۔ڈی(اردو)، یونیورسٹی آف حیدرآباد

جدید غزل کے موضوعات

1960ء کے بعد انسان اعتماد کی دولت سے محروم ہوگیا۔عقاید، اقدار، نظریوں اور روایات پر اعتماد قائم نہ رہا۔اس لیے نئی غزل میں کچھ نئے لفظ اور موضوعات ہاتھ آئے ہیں۔نئی غزل میں میر کی بازیافت زبان سے ہوئی اور موضوعات بدلے۔جنسی بے راہ روی پر بے باکانہ اظہار ہوا۔جدید غزل میں زبان کے فریم کو توڑ کر نئے انداز میں شاعری کی۔یہ ہمہ گیر حقیقت بن گئی۔یہاں عشق کا موضوع بدلہ اور عشق کا ثانوی حیثیت حاصل ہے۔

نئی غزل میں علائم کا استعمال بکثرت ہوا ہے۔نئی تشبیہات، استعارے اور پیکر کا بھی استعمال ہوا ہے۔یہ شاعری کسی خارجی مقصد کے تحت نہیں بلکہ زمانے سے آنکھ ملا کر عرفانِ ذات حاصل کرنے کے بعد وجود میں آئی ہے۔اس کے اظہار کے لیے غزل کا لہجہ بدلا اور شیریں لہجے کی جگہ اکھڑپن اور خود کلامی وغیرہ جیسے اظہار کے نئے اسالیب وجود میں آئے۔اس سلسلے میں رمز وایما کے وسائل بھی بدلے۔کچھ مثالیں ملاحظہ کریں:

اس اضطرابِ شوق کی کوئی سزا تو دو
جاگا ہوا ہوں رات کا دن میں سلا تو دو
(مظہرامام)

ہر ساحلِ فرات کا جان کو خراج ہے
اپنا ازل سے ایک حسینی مزاج ہے
(حسن نعیم)

جہاں بستیاں دل کی آباد تھیں
وہاں بھی ٹرک آنے جانے لگے
(خسرو متین)

بے وقت اگر جاؤں گا سب چونک پڑیں گے
اک عمر ہوئی دن میں کبھی گھر نہیں دیکھا
(بشیر بدر)

نئی غزل میں خوف تنہائی کی وجہ سے آدمی کے باطن میں جھانکنے کی ضرورت پڑی۔اس کی وجہ سے اُسے ماضی کے توانا روایات کو سمجھنے اور اس کے تناظر میں اپنے درد و کرب کو غزل میں پیش کیا۔یہ اشعار دیکھیے:

کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہوگی
سنتے تھے وہ آئیں گے سنتے تھے سحر ہوگی
(فیض احمد فیض)

اڑتی ہے راکھ درد کے خیمے کے آس پاس
تنہائیوں کی آگ میں جلنے لگا ہے کچھ

اس صورت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جدید غزل جامد نہیں رواں دواں ہے۔

جدیدیت کے موضوعاتِ شعر وادب منفرد بھی تھے اور مخصوص بھی۔زیادہ تر موضوعات کا تعلق آدمی کے باطن سے تھا۔چناں چہ شمیم حنفی لکھتے ہیں:

''ان حالات کے باعث لوگوں میں سیاست سے نفرت کے اظہار میں مزید شدت پیدا ہوئی اور انیسویں صدی کے انحطاطی شعراء کی طرح انھوں نے بھی یہ روش اپنائی کہ اس نفرت کے اظہار کے لئے بیرونی حوادث سے خود کو الگ کر کے اپنی ایک الگ دنیا بسائی، جو زماں و مکاں اور اس کے تعلقات سے آزاد صرف ان کی ذات میں گم تھی اس نفرت کا اظہار انھوں نے اس طرح سے کیا کہ صرف خیالی یا حسی تجربوں میں اسیر

ہوگئے اور یوں بھی کہ مادی مسائل کے سلسلہ میں قطعاً خاموشی کو اپنا شعار بنالیا‘‘ ۴؎

شمیم حنفی کے بیان سے واضح ہوگیا کہ جدید غزل میں انسان کے اندر جھانکنے کا رجحان عام ہوگیا اور یہ سفر آگے بڑھا تو فن کار فرائڈ کے نظریہ لاشعور تک جا پہنچا۔ چناں چہ جدید شاعری میں لاشعوری جھلکیاں نظر آنے لگیں ۔ اس سے غزل کے موضوعات میں بڑی تبدیلی آئی ۔ یہ اشعار دیکھیے :

اخلاق، وفا، چاہت سب قیمتی کپڑے ہیں
ہر وقت نہ اوڑھا کرو ان قیمتی شالوں کو
(بشیر بدر)

ایسے زخموں کو کیا کرے کوئی
جن کو مرہم سے آگ لگ جائے
(ساغر صدیقی)

آرزو میرے دل ناکام کی
دن کو جیے جب ہو شام کی
(جمیل مظہری)

جدید شعراء کا رشتہ اپنی زمین اپنے معاشرے اور ماحول سے کافی مضبوط ہوگیا۔ قدیم شاعری میں عشق کو ایک کلیدی حیثیت حاصل تھی ۔ جدید غزل میں اس کی جگہ بدل گئی ۔ اب اس کی جگہ سائنس وٹکنالوجی کے علاوہ حالات انسانی زندگی کی پریشانیوں سے پیدا ہونے والے موضوعات نے لے لی ۔ مثال کے طور پر:

کرفیو بن کے فسادوں میں نظر آتا ہوں
کسی صحرا کا نہیں شہر کا سناٹا ہوں
(خلش بڑودوی)

شہر در شہر ہم جلائے گئے
یوں بھی جشن طرب منائے گئے
(ناصر کاظمی)

جدید غزل کے موضوعات میں جنسی و ذہنی آوارگیوں کو بھی اہمیت حاصل رہی ، جو جدید تہذیب کی دین ہیں۔ تاہم ان موضوعات نے کچھ نئے رنگ بھی اختیار کیے۔ جدید غزل اب صرف جنسی جذبات پر منحصر نہیں رہی بلکہ اس میں ان سماجی اسباب وغیرہ کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا جو جنسی بے راہ روی کے محرک بنے۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے:

تو اس قدر مجھے اپنے قریب لگتا ہے
تجھے الگ سے جو سوچوں عجیب لگتا ہے
(جاں نثار اختر)

دمک رہا تھا بہت یوں تو پیرہن اس کا
ذرا سا لمس نے روشن کا بدن اس کا
(باقی)

زندگی کے مرکزی اور اہم حقائق بھی غزل کے موضوعات میں شامل تھے۔ شمیم حنفی لکھتے ہیں:

’’زندگی کی خواہش اور زندگی سے بیزاری کا احساس ، بے چارگی اور نامرادی کے حوصلہ شکن تجربے اور علم کی پیاس بجھانے کے لئے کائنات کی تسخیر کے منصوبے، دنیا سے دوری کا خیال اور ایک نئی دنیا کی تعمیر کا خواب، حال سے پابستگی اور ماضی کے بازدید کا جذبہ اور مستقبل کے امکانات کی جستجو، تھکن اور لاحاصلی کا کرب اور ان دیکھی منزلوں کی تلاش، فطرت کے ہر بھید کو تعقل کی روشنی سے بے حجاب کرنے کی ہوس اور ایک گونہ بے خودی کا شوق‘‘ ۵؎

مذکورہ اقتباس سے معلوم یہ ہوا کہ یہ ہی وہ موضوعات تھے جن کی بنیاد پر جدیدیت کے رجحان نے فروغ پایا اور اس سے متاثر ہونے والی شاعروں نے اسے اپنایا۔ اور ترقی پسند ادب کو نعرہ بازی کہہ کر نظر انداز کر دیا اور ان مخالف رجحانات کو اپنایا۔ اس وجہ سے بھی غزل اور زیادہ داخلی ہوگئی ۔ یہاں تک اس کی ترسیل بھی دشوار کن ہوگئی اور عجیب وغریب پیش تر ترکیبیں استعمال میں آنے لگیں۔ علاوہ ازیں غزل میں بہت تبدیلی

ہوئی۔جس کے نتیجے میں غزل کے آزاد غزل، گڑبڑ غزل، ٹیڈی غزل وغیرہ جیسی مضحکہ خیز تخلیقات بھی ادب کا حصہ بننے لگیں۔

جدید غزل کے گونا گوں موضوعات میں انسانی تنہائی کا موضوع سب سے زیادہ مقبول رہا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان دورِ جدید میں شدید سماجی اور معاشی بحران کا شکار ہے۔ یہاں انسان لاکھوں میں رہ کر بھی خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔انسان جیسے بکھر سا گیا ہے اور بیگانگی، بے چینی اور پریشانی میں مبتلا ہے۔اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

غم کی فوج سے چھٹے گا کب ہمارے دل کا شہر
جانے کب خوبوں کی اس پر حکمرانی آئے گی

(خالد بدایونی)

ہر ایک سانس پر قائم ہے مسلوں کا
حیات مالِ غنیمت ہے رہزنوں کے بیچ

(ظفر مرد آبادی)

معاشی نا برابری، سیاسی، احتجاج، تشویش و تردّد، سماج میں غیر محفوظیت اور استحصال اور اقدار کی شکست و ریخت جیسے زندگی کے مسائل نے جنم لینا شروع کر دیا۔اور تمام انسانی مسائل کی عکاسی ''نئی غزلوں'' میں واضح طور پر ہوئی ہے۔

حواشی

۱۔محمد عبداللہ خاں خوشگی ''فرہنگ عامرہ، اردو زبان میں مستعمل عربی، فارسی اور ترکی الفاظ، ص:439، 2003ء کتابی دنیا، دہلی،

۲۔فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو شاعری کا فنی ارتقاء، ص:28، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1998ء

۳۔فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو شاعری کا فنی ارتقاء، ص:28

۴۔شمیم حنفی، ''جدیدیت کی فلسفانہ اساس''، ص:108، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025، پہلی بار اکتوبر 1977

۵۔ایضاً """" ص:91

بقیہ صفحہ ۳۷ کا

اس مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حکایتوں میں حظ وانبساط کا پہلو اہم رول ادا کرتا ہے۔جو قاری اور سامع کے لیے تفریح کا سامان فراہم کرنے کے باوصف دانائی اور حکمت کے گوہر عطا کرتا ہے۔لوک کہانیوں اور حکایتوں میں بڑی وسعت ہوتی ہے۔ان میں چرندوں اور پرندوں کی صورت میں انسانی نفسیات کو پیش کیا جاتا ہے۔ان میں ہر طرح کے کردار ملتے ہیں؛ عاقل و دانشور بھی اور احمق و نادان بھی۔ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ حکایتوں میں احمق کردار عاقل کرداروں سے زیادہ فعال اور متحرک ہوتے ہیں اور ان ہی کی وجہ سے حکایتوں میں حظ انبساط کا ماحول بنا رہتا ہے۔اس کی ایک عمدہ مثال ڈوگری لوک کتھایں اور حکایتیں ہیں۔ ان کہانیوں میں ''مورکھ'' کا کردار اپنی حماقتوں سے قاری کو سامانِ تفریح اور حکمت حیات عطا کرتا ہے۔اس طرح حکایتوں میں زندگی کے سبھی اہم روپ ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ہم نے دیکھا ہے کہ حکایتوں کے ذریعے جہاں انسان کے منفی جذبات وخیالات کی بیخ کنی ہوتی ہے وہیں انسان کی صفاتِ حمیدہ کی اہمیت بھی اجاگر ہوتی ہے۔ اور یہ سب کچھ ایک لطیف مزاح کے ماحول میں بیان ہوتا ہے جس سے انسان لطف بھی اُٹھاتا ہے اور بہت کچھ سیکھتا بھی ہے

حواشی:

۱:اردو میں لوک ادب، مرتب پروفیسر قمر رئیس، ص،۱۴۳،۱۴۴،

۳: کتھا سرت ساگر، غلام نبی خیال، شیرازہ، گولڈن جوبلی نمبر شمارہ ۵۔۸،

کلچرل اکیڈیمی کشمیر

کتابیات: ورسائل

۱: حکایات رومی، ترجمہ قاری ذیشان نظامی، بک کارنر شوروم بالمقابل اقبال لائبریری، بک سٹریٹ جہلم،

۲: دلچسپ حکایات سعیدی، مرتب ابن علی، مشتاق بک کارنر، مارکیٹ بازار لاہور

۳:اردو گلستان، ترجمہ مولوی محمد خلیل صاحب، مدینہ پریس بجنور،

۴: پنچ تنتر کی کہانیاں پہلا حصہ، شیو کمار، ترجمہ اطہر پرویز، چلڈنس بک ٹرسٹ نئی دہلی، ۱۹۷۳ء

۵: پنچ تنتر کی کہانیاں دوسرا حصہ، شیو کمار، ترجمہ اطہر پرویز، چلڈنس بک ٹرسٹ نئی دہلی، ۱۹۷۳ء

۶: پنچ تنتر، حصہ سوم، ادارہ تعلیم و ترقی جامعہ دہلی۔

۷: پنچ تنتر کی کہانیاں حصہ چارم، شیو کمار، ترجمہ ساحر ہوشیار پوری، اندر پرستھ پریس، نئی دہلی

۸:اردو میں لوک ادب، مرتب پروفیسر قمر رئیس، دی لکشمی پریس نئی دہلی، ۱۹۹۰ء

۹:ادب لوک گیت اور کہانیاں، شفیق احمد عزیز، نیشنل بک فاؤنڈیشن پاکستان، ۲۰۱۵ء

۱۰:اردو میں لوک ادب اور عورت، ڈاکٹر شاداب سید

۱۱: شیرازہ گولڈن جوبلی نمبر، شمارہ ۵ تا ۸، جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سری نگر

محمد عدنان
پی۔ایچ۔ڈی (ریسرچ اسکالر) مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

عہد وسطیٰ میں علمی تراجم کے باعث نشاۃ الثانیہ کا وجود

علمی تشنگی کو بجھانے اور جدید علوم وفنون کو کما حقہ سمجھنے، جاننے اور اس تک رسائی کے لئے مختلف زبانوں میں موجود بیش قیمتی علوم کی کتب کی حصولیابی اور انہیں مطلوبہ زبان میں منتقل کرنا ازحد ضروری اور لازمی ہوتا ہے، اس کے لئے یکسوئی کے ساتھ اعلی اور ہمہ گیر پیمانہ پر علوم وفنون کی تحصیل وترویج اور تحقیق وتجسیث کرنی ہوگی، مکاتب، مدارس، جامعات، تحقیقاتی مراکز، تراجم کے ادارے قائم کرنے ہوں گے تاکہ اداروں اور مدارس سے نابغہ روزگار علماء، فضلاء، محققین، مؤرخین اور سائنسداں تیار ہوکر نکلیں اور دنیا کو نامعلوم علوم سے آشنا کروائیں۔ جس سے قومیں ترقی کی راہوں پر گامزن ہوسکیں اور علم وآگہی کے میدان میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام ہوسکیں۔

علوم وفنون کی ترقیات کے تئیں ترجمہ نے مختلف اقوام کے ذہنی وفکری، لسانی وتہذیبی، اختراعی وفنی اور سیاسی وعسکری پہلوؤں کو کافی حد تک متاثر کیا ہے۔ انہی تراجم کے ذریعہ ان اقوام کو علم وتحقیق اور ایجادات کے میدان میں آگے بڑھنے کا حوصلہ ملا۔ ترجمہ کے ذریعہ روشن خیالی اور علمی ترقی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

عہد وسطیٰ میں عربوں نے مختلف علوم وفنون جیسے علم فلکیات، علم کیمیا، علم طب وغیرہ جیسے دوسرے علوم میں کارہائے نمایاں انجام دیے اور اسی طرح انہوں نے الجبراء اور حساب کے عدد بھی ایجاد کیے۔ اس کے علاوہ انہوں نے وقت کا پتہ لگانے کا طریقہ ایجاد کیا اور اس سے متعلق بہت سارے آلات ایجاد کیے۔ یہ سب کچھ انہوں نے ترجمے کے ذریعہ قدیم ثقافتوں کو زندہ اور محفوظ رکھتے ہوئے انجام دیا۔

عہد وسطیٰ کے متعلق یوں مذکور ہے کہ اس عہد میں عربوں نے دُنیا کی تمام قوموں کے علوم وفنون کو اپنی زبان میں منتقل کرلیا تھا اور اگر عربوں (اس میں بالخصوص مسلمانوں) کا قدم اس طرف نہ بڑھتا تو یونان، مصر، ہندو فارس کے تمام علمی ذخیرے برباد ہوچکے ہوتے۔ اس میں مختلف علوم طب، کیمیا، فلسفہ، ہیئت، ریاضی وغیرہ شامل ہیں، پہلے طبی علوم کی شروعات ہوئی، آگے چل کر بنی عباس کے زمانے میں باقاعدہ تراجم کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا، اس کے بعد یکے بعد دیگرے خلفاء کے زمانے میں اس کام میں مزید تقویت آتی گئی اور مختلف قوموں کے علمی سرمائے کو ترجمہ کے ذریعہ عربی زبان میں منتقل کردیا گیا، اس طرح ہر قوم کے علمی سرمائے و ذخیرے کو اپنے قبضہ میں کرلیا۔ ان کی پانچ سو سالہ دور حکومت میں ہمہ گیر ترقی کافی پروان چڑھ گئی جس کی بنیاد نویں اور دسویں صدی میں قدیم علوم وفنون کے احیاء پر تھی جسے مشرق کا نشاۃ الثانیہ کہا جاتا ہے۔

یورپ نے عربوں کے نقش قدم کو اپنایا اور ان کے علمی ذخائر کو اپنی زبان میں منتقل کرکے اتنا بڑا انقلاب برپا کیا کہ دنیا نے دیکھا کہ اگر کوئی قوم ترقی کی منزلیں طے کرنا چاہے تو کوئی طاقت نہیں جو اسے روک سکے، یوروپین اقوام نے عربوں کے مختلف علوم وفنون کو اپنی زبانوں میں منتقل کرکے اپنی قوم کو اس سے بہرہ ور کیا، ان ترجمہ شدہ کتابوں کو باقاعدہ اپنے تعلیمی نصاب میں شامل کیا۔ یورپین اقوام نے عربوں کے علوم کی مدد سے نشأۃ الثانیہ کو وجود بخشا، جسے ہم یورپی نشاۃ الثانیہ (European Renaissance) سے یاد کرتے

ہیں۔بعض علوم کی کتابوں کے متعلق تو یوں مذکور ہے کہ یوروپی نصاب تعلیم میں برسہا برس تک وہ کتابیں داخل نصاب رہیں اوراس سے بے حدو بے شمار لوگوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔اسی کے تیئں قرونِ وسطیٰ میں ترقیوں کے باعث نشاۃ الثانیہ کا آغاز اور فکر انسانی کو جلا ملی۔

عہدوسطی میں ترجمے نے علوم وفنون کے تراجم کے سلسلے بیش بہا کارنامے انجام دیئے ہیں،اس زمانے میں مختلف علوم جیسے جغرافیہ،طب،ادب،ہندسہ وغیرہ کے کافی تراجم منظر عام پر آئے،اوردنیا نے اس سے بھرپور استفادہ کیا۔

عہدوسطیٰ کی گیارہویں اور بارہویں صدی میں ادریسی نام کا ایک عظیم جغرافیہ داں نظر آتا ہے۔وہ جغرافیہ کے علاوہ دوسرے علوم میں بھی دستگاہ رکھتا تھا مگر جغرافیہ اورنقشہ کشی کےفن میں وہ قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا ماہر تھا۔جس کی قرون وسطیٰ میں مثال پیش کرنے سے دنیا قاصر وعاجز رہی ہے۔فلپ ہٹی لکھتا ہے:

The best known geographer of the" Bakri, a-eleventh century was al Arab, and the most brilliant Hispano geographer and cartographer of the twelth century, indeed of all Idris, a-medieval time, was al descendant of a royal Spanish Arab family who got his education in "Spanish.

(568:History of Arab.P.P)

"گیارہویں صدی کے سب سے مشہور جغرافیہ داں البکری تھے،جواندلسی عرب تھے،اور بارہویں صدی کے سب سے بڑے باکمال جغرافیہ داں مصنف اورنقشہ کش، بلکہ پورے عہدوسطیٰ کے سب سے بڑے جغرافیہ داں ادریسی تھے،جو اسپین کے ایک شاہی خاندانی نسل میں سے تھے،جنہوں نے اسپین میں تعلیم پائی تھی۔"

(قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کے سائنسی کارنامے۔ص ۱۳)

عربی میں جن علوم کی منتقلی ہوئی،اس میں بہت سے علوم یونانی زبان کے اندر موجود تھے،اس میں عظیم علماء اورفلاسفہ گذرے ہیں۔علم طب میں سب سے پہلا شخص جس نے اس فن کو باقاعدہ مرتب کیا اوراس فن پر کتابیں لکھیں،وہ بقراط ہے۔اس نے علم طب کو عام کیا۔یہی وہ شخص ہے جس کی گونا گوں محنت کے باعث یہ علم عام ہوا،اگرایسا نہ ہوتا تو شاید یہ علم عام نہ ہوتا۔اس فن میں بقراط،جالینوس وغیرہ نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔

علامہ شبلی نے بقراط کی خدمات کے متعلق کچھ یوں لکھا ہے کہ:

"بقراط کی طرف اگرچہ بہت سی کتاب منسوب ہیں لیکن ان میں سے ۳۰ کتابیں قطعی طور سے اس کی تصنیف کہی جاسکتی ہیں،چنانچہ یہ سب ترجمہ کی گئیں اوران میں سے ۱۶،اس قدر مقبول ومتداول ہوئیں کہ درس میں داخل ہوگئیں"۔

(مقالات شبلی،ج۔۶،ص۔۲۵)

بقراط کی تصنیفات کافی گراں قدر رہی ہیں،جنہیں بڑے پیمانے پر ترجمے کرکے پیش کیا گیا۔ان کی تصنیفات کے تراجم میں حنین،عیسیٰ بن یحییٰ،موسیٰ شاکر حبیش وغیرہ کے نام بطور مترجم کافی نمایاں نظر آتا ہے،جنہوں نے بقراط کی تصنیفات کا ترجمہ کرکے دنیا کواس سے واقف کروایا۔

علم طب کی دنیا میں ایک نام جالینوس کا بھی آتا ہے،اس نے اس علم کے متعلق بہت سارے نئے مسائل دریافت کیے اوربعض علماء کے مطابق جالینوس نے اس علم کو اس حدتک پہونچایا کہ مزید اس میں کچھ زیادہ اضافہ نہیں ہوسکا۔عربوں نے اس کی تصنیفات کے متعلق اپنی قوم کو باخبر کرنے کے لیے ترجمہ کے ذریعہ گراں قدر خدمات انجام دیں۔مذکور ہے کہ بقراط کی ایک کتاب "البرہان" کی تلاش میں

مختلف ممالک کی خاک چھانی گئی،لیکن جالینوس کی کتابوں کی تلاشی میں خوداس کی تیار کردہ فہرست سے بہت آسانی ہوئی۔ پہلے پہل اس کی تیار کردہ فہرست کا ترجمہ کیا گیا، پھراس کی مدد سے کتابوں کی تلاش عمل میں لائی گئی۔ان کی کتابوں کے ترجمہ کرنے میں مشہور ومعروف عرب مترجم حنین بن اسحٰق نے اپنی ساری عمر صرف کردی، چنانچہ اس نے تقریباً ۱۲ کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ وتشریح کرکے عرب قوم کواس سے واقف کرایا۔

تراجم کے ضمن میں علم ادب میں بھی گراں قدر کارنامے انجام دیئے گئے ہیں۔اگر اس سلسلے میں عربی زبان کا جائزہ لیاجائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تو عہداموی میں اس کی ابتداہوتی ہے۔پھر اس کے بعد کے ادوار میں ادب کا اطلاق نظم،نثر،انساب،اخبار،لغت،نحو،صرف اورتنقید پر ہونے لگا۔ادب ترقی کرتارہا اور بہت سے نامور ادباء پیداہوئے۔اس سلسلے میں عربی زبان میں ادب کی اصولی چار کتابیں منظرِ عام پرآئیں۔

۱۔ادب الکاتب ابن قتیبہ، ۲۔الکامل للمبرد،۳۔ البیان والتبیین للجاحظ،۴۔کتاب النوادر لابی علی القالی۔

(عہد مامون میں طبی وفلسفیانہ کتب کے تراجم۔ص،62)

اس کے بعد عباسی دور میں بہت سی ادبی کتابیں عربی میں منتقل ہوئیں۔عربی ادب میں ابن المقفع کا نام سرفہرست ہے۔اس نے فارسی سے عربی میں بہت سی کتابیں ترجمہ کیں،مثلاً اس کی بہت مشہور کتاب ''کلیلۃ ودمنۃ''۔اس کے علاوہ دوسری کتابوں سے اخذواستفادہ کرکے کچھ تالیفات بھی کیں۔مثلاً الادب الکبیر، الادب الصغیر وغیرہ۔الغرض علوم کے ضمن میں مذکورہ علوم کے علاوہ دوسرے علوم میں بھی تراجم کا بہت بڑا کام انجام دیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ عہدِ وسطی میں بذریعہ تراجم بیش قیمت علمی ذخائر کی منتقلی کا کام انجام دیا گیا، اورجس کے توسط سے نشأۃ الثانیہ کا وجودعمل میں آیا،مؤرخ نے ان تمام ترکارہائے نمایاں کو تاریخ کی کتب میں سنہرے حروف میں محفوظ کر رکھا ہے۔علماء نے ان تمام چیزوں کا سہرااس وقت کے علم دوست افراد کی کوششوں اوران کی جانفشانیوں کو باندھا ہے کہ انہوں نے اپنی انتھک محنت ولگن کے ذریعہ دنیا کوعلمی وآگہی سے بہرہ ورکیااورعلوم وفنون سے اقوامِ عالم کوواقف کروایا۔اس ضمن میں دنیا کی مختلف اقوام نے اپنی اپنی زبانوں کوعلوم وفنون سے ثروت مند بنایا، اردوزبان بولنے والوں نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کرحصہ لیااوراس کوبھی علوم وفنون سے آگاہ کیا۔آج ہمیں اردو میں جو مواد دستیاب ہے ان میں اکثر ہمارے متقدمین ماہرین علم وفن کارہین منت ہے۔

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر
UNANI CENTER FOR CARDIAC CARE

Consultation Time
Morning:11:00 am to 2:30 pm-Evening:7:00 pm to 9:30 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colon
Tolichowk Hyderabad - 500008 T.S India

شازیہ تمکین

پی ایچ-ڈی ریسرچ اسکالر (اردو) مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد

دردؔ کی ایک غزل: تفہیم و تجزیہ

ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

وحدت میں تیری ،حرف دوئی کا نہ آ سکے
آئینہ ،کیا مجال، تجھے منہ دکھا سکے

میں وہ فتادہ ہوں کہ بغیر از فنا مجھے
نقشِ قدم کی طرح نہ کوئی اٹھا سکے

قاصد ! نہیں یہ کام ترا،اپنی راہ لے
اسکا پیام ،دل کے سوا کون لا سکے

غافل!خدا کی یاد پہ مت بھول زینہار
اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے

یارب!یہ کیا طلسم ہے،ادراک و فہم یاں
دوڑے ہزار،آپ سے باہر نہ جاسکے

گو بحث کر کے بات بٹھائی بھی،کیا حصول!
دل سے اٹھا غلاف ،اگر تو اٹھا سکے

اِطفائے نارِ عشق،نہ ہو آبِ اشک سے
یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے

مستِ شرابِ عشق،وہ بے خود ہے،جس کو حشر
اے دردؔ! چاہے لائے بہ خود ،پھر نہ لا سکے

اردو ادب کا سنہرا دور یعنی میرؔ و سوداؔ کے عہد کے تیسرے بڑے شاعر خواجہ میر دردؔ شاعری میں اپنی انفرادی خاصیت کی بدولت منفرد مقام کے حامل ہیں۔ دردؔ کی شخصیت اپنے معاصرین میں اس لیے منفرد ہے کہ ان کے یہاں وہ توازن نظر آتا ہے جو اس غیر متوازن دور میں تصوف کے ذریعے ان کے کردار اور مزاج میں پیدا ہوا تھا۔ وہ ایک بڑے شاعر اور ایسے باکمال صوفی تھے کہ جس نے شریعت، طریقت،حقیقت و معرفت کے مدارج طے کیے تھے۔انہوں نے ایک طرف تصوف کی بلند پایہ نثری تصانیف قلم بند کیں تو دوسری طرف شاعری میں معرفت وحقیقت کے ایسے پھول کھلائے جو آج بھی تر و تازہ ہیں۔دردؔ نے خود اپنی شاعری کے بارے میں کہا ہے کہ:

''میرے سخن ہائے شیریں ایک ایسا خوانِ نعمت ہے کہ جسے میں نے اہلِ ذوق کے لیے چن دیا ہے۔'' (نالۂ درد)

پھولے گا اس زمیں میں بھی گلزارِ معرفت
یاں میں زمینِ شعر میں یہ تخم بو گیا

دردؔ کے دیوانِ اردو میں تقریباً پندرہ سو اشعار موجود ہیں۔جس میں زیادہ تر غزلیات ہیں۔اور ان میں زیادہ تر اشعار ایسے ہیں جن میں صوفیانہ فکر،ان کے جذبۂ شوق کی چمک اور اپنے خاندانی تجربے کی گرمی کے ساتھ مل کر اس طرح ظہور پذیر ہوتی ہے کہ ان سے پہلے کسی اور شاعر کے ہاں اس طرح بیان میں نہیں آئی۔بقول جمیل جالبی:

''اگر دردؔ کے اشعار میں یہ لہر نہ ہوتی تو وہ میرؔ کی شاعری کے دریا میں قطرہ بن کر غائب ہو جاتے۔''

دردؔ کا عہد ایک ایسا دور تھا کہ سارا برِ عظیم فتنا وفساد کا شکار تھا۔مغلیہ سلطنت مانو زوال پذیر ہی تھا۔مسلمانوں کے عقائد انتشار کا شکار تھے۔اس دور میں تصوف ہی نے انسان کے زخموں پر مرہم رکھا۔اگر اٹھارویں صدی میں تصوف یہ کام نہ کرتا تو مسلم معاشرہ زوال کی دلدل سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔اس لیے اس عہد کی عشقیہ شاعری میں متصوفانہ مسائل وموضوعات کی افراط ملتی ہے۔

ا:- زیرِ نظر غزل دردؔ کی صوفیانہ عقیدت اور معرفتِ حق،لا محدود جذبۂ شوق اور محدود فہم و ادراک،عقلِ عاجز اور عشقِ رسا کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔بنیادی طور پر تصوف کا منصب تہذیبِ نفس اور اصلاحِ فرد ہے۔اس لیے اس میں دو پہلو ہمیشہ نمایاں رہے

ہیں۔ایک احترام وعظمتِ انسان اور دوسرا اخلاق۔اس غزل کے پہلے شعر میں دردؔ نے تخلیقِ الٰہی میں انسان کی عظمت کا قصیدہ سنایا ہے۔اگر ہم اس کے لغوی معنی پر نظر مرکوز کریں تو زمین وآسمان کی حد بندی میں اتنی وسعت نہیں ہے کہ وہ اللہ کی وسعت کو پا سکے،مگر ایک انسان کا دل ہی ہے جس میں اللہ سما سکتا ہے۔

یہاں ہم ظاہری معنی پر غور کریں تو قولِ محال کی کیفیت جھلکتی ہے۔یعنی ظاہری طور پر زمین وآسمان کی وسعت کئی کروڑ گنا زیادہ ہے ایک گوشت کے ٹکڑے یعنی دل سے۔پھر کوئی ایسی شئے جو اس چھوٹے سے ڈبے میں سما سکتی ہے تو اس کے وجود کے لیے یہ وسیع وبسیط ارض وسما کیسے کم پڑ سکتے ہیں۔اور یہ غیر واقعیت کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ شعر میں مجاز مرسل کا استعمال بھی بڑی چابک دستی سے کیا گیا ہے۔اگر ہم ارض وسما اور دل کو ظرف تصوّر کریں تو یہاں مظروف کوئی مادّی شئے نہیں ہے جس کے قیام کے لیے کسی مکان کی ضرورت ہو۔

اقبالؔ اللہ کے لیے لفظ ''حریم'' لایے ہیں۔''ع :-میرے نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں۔''حریم یعنی ایسا مقام جہاں کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہ ہو۔اور یقیناً اس فانی جسم کے ساتھ ذاتِ باری تعلیٰ تک کوئی رسائی حاصل نہیں کرسکتا۔اللہ کے لیے حریم یعنی لامکاں کی اصطلاح نہایت ہی موزوں ہے۔آتشؔ کا ایک شعر ملاحظہ ہو:-

بُت خانہ توڑ ڈالیے مسجد کو ڈھایئے
دل کو نہ توڑیئے یہ خدا کا مقام ہے

اقبالؔ نے لامکاں کے لیے لفظ' حریم' کا استعمال کیا وہیں دردؔ اور آتشؔ نے لفظ' دل' کا استعمال کیا۔اللہ کی ذات کسی مکان میں مقید نہیں رہ سکتی۔یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان کا دل ایک مادّی شئے ہونے کے باوجود لامکاں کے مماثل ہے۔یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک مرئی اور مادّی شئے ہونے کے باوجود دل کو یہ رتبہ کیسے نصیب ہوا؟

انسانی فطرت کا سب سے قوی جذبہ عشق ہے چاہے وہ عشقِ مجازی ہو یا عشقِ حقیقی۔اور عشق کا براہِ راست تعلق دل سے ہے۔عشق دل ہی میں پیدا ہوتا ہے اور پھلتا پھولتا ہے۔عشق اور دل کا رشتہ عاشق ومعشوق کے مانند ہے ایک کے بنا دوسرے کی ہستی نیستی کے برابر ہے۔اس ضمن میں آتشؔ کا ایک شعر غور طلب ہے:-

دل کے لیے ہے عشق تو دل عشق کی خاطر
مے ہے تو یہ ہے اور جو مینا ہے تو یہ ہے

آیئے اب عشقِ حقیقی کی طرف رجوع کرتے ہیں،جس میں عشق بے لوث ہوتا ہے۔اس میں وصل کی تڑپ، اضطرار کی کیفیت اور سرشاری تو رہتی ہے مگر مجازی عشق کی طرح وصلِ جسمانی کی آرزو نہیں رہتی۔یہ عشقِ الٰہی ہے،اس میں عاشق کا قلب ماسوا سے خالی ہو جاتا ہے۔یہی وہ عشق ہے جو صوفیوں کا راستہ اور منزلِ مقصود ہے اور جسے عشقِ حقیقی کا نام دیا جاتا ہے،جو صرف بنی نوع انسان کی ہی ملکیت ہے۔اقبالؔ کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

مقامِ شوق تیرے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد!

دیگر شعرا کی طرح عظمتِ انسان کا تصوّر دیوانِ دردؔ میں اکثر وبیشتر اشعار میں موجود ہے۔کیونکہ عظمتِ انسان دردؔ کا بنیادی تصوّر ہے۔ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:-

باوجود یہ کہ پروبال نہ تھے آدم کے
وہاں پہنچا، کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا

اسی طرح اس غزل کے پہلے شعر میں بھی انسان کی اشرفیت کو ثابت کیا ہے کہ انسان کے دل کے علاوہ کل کائنات میں اتنی وسعت موجود نہیں ہے کہ اس میں ذاتِ الٰہی قیام پذیر ہو سکے۔یعنی ایک انسان ہی ہے جو جذبۂ ہائے شوق سے معمور ہے اور کل کائنات اس پیامِ شوق سے عاری۔

۲:- دوسرے شعر میں اللہ کی وحدانیت کی طرف اشارہ ہے۔یعنی اللہ واحد ہے جس میں دوئی کا ایک حرف تک نہیں آسکتا۔اس لیے آئینہ کی بھی یہ جرأت نہیں ہے کہ وہ اسے اپنا منہ دکھا سکے۔یہاں ایک لفظ آئینہ ہے جو غور طلب ہے۔بقول ابوالکلام قاسمی:-

''دردؔ کے کلام میں عموماً عشقیہ مسائل کا سارا ارتکاز صفائے قلب اور تزکیۂ نفس پر قائم ہے۔اس ضمن میں دردؔ کی غیر معمولی انفرادیت وہاں نمایاں ہوتی ہے جہاں وہ عکس،نظارہ،جلوہ اور دیدار کے تلازمات میں گفتگو کرتے ہیں اور یہ سارے تلازمات

اپنی اصل کے اعتبار سے آئینے کے محور و مرکز پر رقصاں نظر آتے ہیں۔''

اس طرح سے آئینہ دردؔ کا بنیادی اور مرکزی استعارہ بن جاتا ہے۔ایک جگہ فرماتے ہیں:-

آئینۂ عدم ہی میں ہستی ہے جلوہ گر
ہے موج زن تمام یہ دریا، سراب میں

اس دوسرے شعر میں بھی آئینہ کثرت و وحدت کی عدم تفریق کا استعارہ ہے۔اس کے ساتھ ساتھ وحدت و کثرت کے مسئلے کو آئینے کے منہ دکھانے کے محاورے سے تعبیر کیا ہے۔جب ہم آئینہ دیکھتے ہیں تو اس میں ہمارا عکس دکھائی دیتا ہے۔حقیقی طور پر نہ سہی مزاجاً کچھ دیر کے لیے ہی ایک ہم شکل انسان کا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔جس سے وحدانیت کی ہستی کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔اس شعر میں بھی غیر واقعیت موجود ہے کہ کیوں ایسا کبھی ہو کہ آئینہ اللہ کو منہ دکھانے کی جرأت کرے۔مگر آئینے نے جرأت کی تو ذاتِ الٰہی کی وحدانیت پہ بھی حرف آسکتا ہے جو قطعی ناممکن ہے، کیونکہ اس کی ہستی واحد ہے جس میں دوئی کو کوئی دخل ہی نہیں۔

۳:- تیسرے شعر کے لفظی لغوی معنی پر غور کیا جائے تو یہ مطلب نکلتا ہے کہ میں ایک گرا پڑا حقیر انسان ضرور ہوں لیکن نقشِ قدم کی طرح میری معیّن فنا پذیری سے پہلے مجھے کوئی فنا نہیں کرسکتا۔

اس شعر میں ''فتادہ'' کی رعایت سے ''نقشِ قدم'' اور ''فنا'' کی رعایت سے ''اٹھا'' لفظ لاکر معنوئی گہرائی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔پہلے مصرے میں ''فتادہ'' اور دوسرے مصرعے میں ''نقشِ قدم'' لاکر انکسار اور فروتنی جیسے انسانی رویے کی عکّاسی کی گئی ہے۔یہاں دردؔ نے انسان کو حقیر اور کمتر کہا۔کیونکہ انسان کے ساتھ ساتھ شیطان کو بھی اللہ نے اس دنیا میں نازل کیا ہے اور اس دنیا کی ابتداء ہی ایسی ہوئی تھی کہ شیطان کے بہکاوے میں آکر آدمؑ مرتکب قرار پائے تھے۔پھر حکم الٰہی سے جنّت سے اخراج اور دنیا میں نزول کا سامنا کرنا پڑا تھا۔اس لیے اقبالؔ کہہ رہے ہیں کہ:-

اے صبح ازل انکار کی جرأت ہوئی کیوں کر؟
مجھے معلوم کیا! وہ رازداں تیرا ہے یا میرا

یہاں میرا مقصد یہ بتانا ہے کہ اللہ نے دنیا بنانے کے ساتھ ساتھ یہاں اپنے مدّ مقابل شیطان کو بھی بھیجا کہ وہ اس کے بندے کو راہِ راست سے بھٹکائے اور اللہ کی بندگی اُسے سراطِ مستقیم پر بنائے رکھے۔مگر انسان شیطان کے غلبے کی بدولت گناہ میں ملوّث ہو جاتا ہے۔اس لیے دردؔ نے فتادہ کا لفظ استعمال کیا ہے کہ اسی گناہ کی بدولت اسکی بندگی میں خلل آرہا ہے۔مگر اس میں عجز و انکساری بھی موجود ہے کیوں کے گناہ کے بعد اسکا احساس بھی رکھتا ہے۔یہی احساس ہی تو ہے جس نے حضرت آدمؑ اور حضرت حوّا کو اپنے گناہ کی بخشش کے لیے اللہ کے حضور گڑگڑانے پر مجبور کیا۔

''دونوں کہنے لگے کہ اے ہمارے رب ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا۔اور اگر آپ ہماری مغفرت نہ کریں گے اور ہم پر رحم نہ کریں گے تو واقعی ہمارا بڑا نقصان ہو جائے گا۔''
(سورۂ اعراف آیت نمبر۲۳)

''فتادہ'' کی رعایت سے دوسرے مصرعے میں ''نقشِ قدم'' کا لانا اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ قدم کا نقش بھی ایک حقیر شئے کی طرح زمین پر ہی موجود رہتا ہے۔اسی طرح ''فنا'' کی رعایت سے دوسرے مصرعے میں ''اُٹھا'' لفظ لائے ہیں۔یعنی جب یہ خاکی جسم فنا ہوتا ہے تو اسکے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ ''فلاں شخص دنیا سے اٹھ گیا۔''

جس طرح نقشِ پا یا نقشِ قدم کے فنا کا باعث دوسرا نقشِ قدم یا آب، باد یا دیگر مرئی یا غیر مرئی اشیا ہوتے ہیں۔مگر گناہ گار انسانی زندگی کو کوئی مادّی شئے فنا نہیں کرسکتی ہے۔ایک موت ہی ہے جو اس چیز پر قادر ہے۔''موت'' کے تصوّر کو دردؔ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:-

آہ معلوم نہیں ساتھ سے اپنے شب و روز
لوگ جاتے ہیں چلے سو یہ کدھر جاتے ہیں

۴:- چوتھے شعر میں دردؔ قاصد کو اس کے کام سے روک رہے ہیں کہ اللہ کا پیام بندے تک پہنچانا تیرا کام نہیں ہے۔اور انہیں اس کام کے لیے دل قاصد سے زیادہ موزوں اور قابل لگا،اس لیے انہوں نے یہ رائے دے دی کہ صرف دل ہی یہ کام کرسکتا ہے۔اس شعر میں بھی واقع سے انحراف کیا گیا ہے۔مذہبی حوالے سے ہمیں یہ پتہ ہے کہ دنیا میں کچھ کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے گئے جنہوں نے اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے کا کام انجام دیا۔مگر دردؔ اب اس قاصد کو اُلٹے پاؤں لوٹ جانے کی ترغیب دیتے

ہیں، کیوں کہ اس کے لیے اب کوئی کام نہیں بچا اور اسکا کام اب دل کے علاوہ کوئی نہیں کرسکتا۔ دردؔ کا ایک شعر ملاحظہ ہو:-

دل کو سیاہ مست کر، کچھ بھی تجھے جو ہوش ہے
کہتے ہیں کعبہ اس کو، اور کعبہ سیاہ پوش ہے

بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:-

''میر درد نے وحدت الوجود اور وحدت الشہود پر بحث کرنے کے بعد یہ واضح کیا کے دونوں کا مقصد ایک ہے اور یہ مقصد طریقِ محمدی میں ایک ہوگیا ہے اور یہی توحیدِ مطلق ہے۔''

اس شعر میں بھی دردؔ کا اشارہ طریقِ محمدی کی طرف ہے۔ یعنی ہمارے آخری نبی حضرت محمدؐ ہیں۔ اللہ نے آپؐ پر ہی نبوّت کا خاتمہ کیا۔ قرآن جو آخری ذریعۂ پیغام تھا اللہ کا اس کے بندوں کے لیے، وہ آپؐ پر ہی اُتارا گیا۔ اب اور کسی قاصد کی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ قرآن اور حدیث یعنی طریقِ محمدی سے ہی دل کی تاریکی دور ہوسکتی ہے اور وہ رونق افروز ہوسکتا ہے۔

اس لیے درد کہہ رہے ہیں کہ چونکہ اللہ بذاتِ خود انسانی دل میں مقیم ہے تو اس لیے دل اللہ کے ہر پیام سے آگاہ ہے۔ جہاں پہلے شعر میں درد نے دل کو ''لامکاں'' کا درجہ عطا کیا وہیں اس شعر میں اُسے پیغمبری بخش دی۔

۵:- پانچویں شعر میں خدا کی یاد سے غافل انسان سے دردؔ یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ خود کو بھلا سکو تو بھلا دو کیوں کہ خود فراموشی کے عالم میں ذاتِ الٰہی تک رسائی حاصل ہوسکتی ہے۔

اس شعر میں صنعتِ اشتقاق کے استعمال نے اس کے حسن کو دوبالا کردیا ہے۔ ایک لفظ ''بھولنا'' کو مختلف طرح سے برتا گیا ہے۔ پہلے مصرعے میں ''بھول'' اور دوسرے مصرعے میں ''بھلا دے'' اور ''بھلا سکے'' کے استعمال سے اس شعر میں غنائیت پیدا ہوگئی ہے۔ دو متضاد الفاظ ''یاد'' اور ''بھول'' کا استعمال کر کے معنی میں گہرائی اور گیرائی پیدا کی گئی ہے۔

اس دنیاوی عشق میں ملوّث ہوکر ہم اس دنیا کے بنانے والے سے ہی غافل ہو جاتے ہیں۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں یہ دنیا ایک ایسا مکان ہے جسے بلاؤں نے گھیر رکھا ہے۔ اس کے حالات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے۔ یہ دنیا تمہارا گھر نہیں ہے نہ وہ تمہاری منزل ہے، جس کے لیے تم پیدا کیے گیے ہو۔ اگرچہ یہ تم کو فریب دے رہی ہے، اس کے فریب میں نہ آجاؤ، اس کی طمع چھوڑ دو۔ اکبرؔ نے دنیا کو بے وفا اور زندگی کو فروغ چند ساعت قرار دیا ہے۔

کسی کے ساتھ دنیا نے وفا کی ہی نہیں اب تک
تو کیوں ہو رہوں اس کا جو میری ہو نہیں سکتی

اس دنیا کے حسن سے متاثر ہو جانے والے انسان کو اقبالؔ کہتے ہیں:-

آیا ہے تو جہاں میں مثل شرار دیکھ
دم دے نہ جائے ہستی نا پائدار دیکھ

فانی اس فانی دنیا کی عکّاسی اس طرح کرتے ہیں:-

شعبدے آنکھوں کے ہم نے ایسے دیکھے ہیں
آنکھ کھلی تو دنیا تھی، بند ہوئی افسانہ تھا

خود دردؔ نے اپنے وقت کے انتہائی مالدار خاندان میں آنکھ کھولی تھی مگر تمام مال و دولت کو اللہ کی راہ میں لٹا دیا۔ اور فقیری کی دولت سے مالا مال ہوگئے۔ خود فرماتے ہیں:-

دولتِ فقر کے حضور، گرد ہے جاہ و سلطنت
کہتے ہیں یاں جسے ہُما، اپنی نظر میں زاغ ہے

قدیر احمد ''خواجہ میر درد اور ان کا ذکر و فکر'' میں فرماتے ہیں:-

''سالک کا دل جب مکان، لباس اور خوراک جیسی ضروریاتِ زندگی سے مستغنی ہوتا ہے تو اس میں صبر و قناعت اور توکل کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جو ایک صوفی کے لیے ضروری ہے، اسی لیے آپ (دردؔ) کے سلسلہ کی پہلی شرط مال و متاع سے بے نیاز ہوکر اپنے نفس کو آزاد کرنا ہے۔''

ظاہری جاہ و دولت اور آرام و آسائش کو خیر باد کر انسان باطنی دولت سے ہمکنار ہوتا ہے، خودی سے اسکی شناسائی قائم ہوتی ہے، اور پھر بے خودی کے عالم میں خود کو فراموش کر ذاتِ الٰہی تک پہنچ پاتا ہے۔ خودی کی تلاش و جستجو اور اس کے وجوہات کے تئیں دردؔ یوں فرماتے ہیں:-

سنتے ہیں یوں کہ آہ تو ہم میں ہے چھپ رہا کہیں
اپنی تلاش سے غرض ہم کو ترا سُراغ ہے

اس طرح عاشق خود کو فراموش کر اپنے معین مقصد کو حاصل کر پاتا ہے۔

۶ اور ۷:- چھٹے اور ساتویں اشعار میں ایک ہی موضوع کو مختلف

پیرائے میں قلم بند کیا گیا ہے۔ پہلے شعر میں دردؔ نے عقل وفہم کی محدودیت کے طلسماتی پردے کو اُٹھانے کی کوشش کی ہے، اور اسکی انتہا کو ابتدا کے مماثل قرار دیا ہے۔ اور دوسرے شعر میں عقل کی پرستش کرنے والے فلاسفر اور دانشوروں کو بحث و مباحثہ چھوڑ کر حقیقت سے آشنا کرانا چاہتے ہیں۔

چھٹے شعر کے پہلے مصرعے میں صنعتِ استفہام کا استعمال کر کے دردؔ عقل وفہم کی طلسم کو لے کر اللہ سے سوال کر رہے ہیں اور دوسرے مصرعے میں اسکا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ درد کے تصوّرِ عشق کے مطابق عشق ہی سے نظامِ کائنات قائم ہے۔ یہ عشق ہی ہے جو انسان کو علویت بخشتا ہے۔ عقل عاجز ہے اور عشق رسا۔ عشق ہی بنیادی مسائل کا طبیب ہے۔ جب عشق کی حکمرانی قائم ہوتی ہے تو انسانی اقدار کو افتراع نصیب ہوتی ہے۔ اقبالؔ یوں مخاطب ہیں:-

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عشق کی بدولت جو بلند پروازی نصیب ہوتی ہے وہاں تک کبھی عقل کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ عقل نے جس چابکدستی سے طلسم جال بچھایا ہے، نارِ عشق کے روبرو وہ اتنا ہیچ ہے کہ اسکا ایک شرارہ اس طلسم کو جلا کر راکھ کر دینے کے لیے کافی ہے۔ عقل کی باتیں اتنی مبہم ہوتی ہیں کہ وہ خودی میں ہی الجھا کر رکھ دیتی ہیں۔ شرابِ بے خودی کی لذّت حاصل کرنے کے لیے خودی کا زینہ طے کرنا لازمی ہے۔ عقل خودی سے باہر ہی نہیں نکل سکتی تو بے خودی تک کیسے رسائی حاصل کرسکتی ہے۔ دردؔ یوں رقم طراز ہیں کہ:-

باہر نہ آسکی تو قیدِ خودی سے اپنی
اے عقلِ بے حقیقت! دیکھا شعور تیرا

چھٹے شعر میں بھی اسی موضوع کو باندھا گیا ہے۔ بس صرف پیرائیہ بیان میں فرق ہے۔ فہم وادراک کو طلسم سے تشبیہہ دی ہے۔ صوفیہ عقل کو بے کار نہیں سمجھتے لیکن انکا عقیدہ ہے کہ حقیقتِ مطلق کا ادراک عقل کے ذریعے نہیں ہوسکتا۔ یہ کام صرف عشق ہی انجام دے سکتا ہے۔ دردؔ کے یہاں عشق کا یہی تصوّر ہے۔ وہ اسے طرح طرح سے اپنے اشعار میں بیان کرتے ہیں۔

اب ساتویں شعر کو ہی لیجیے یہاں بھی خوش فہمی میں مبتلا شکست خوردہ عقل کو فضول کے بحث (جس کا کوئی حاصل نہیں) سے دور رہنے اور اپنے دل پر پڑے غلط فہمی کے غلاف کو ہٹانے کی ترغیب دی ہے۔ یہاں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ابتدا سے لے کر اب تک عقل اور عشق میں معرکہ آرائی رہی ہے اور ہمیشہ عشق کے مقابلے عقل کو اپنے منہ کی کھانی پڑی ہے اور پیرہنِ شکست زیب تن کرنا پڑا ہے۔ اور چونکہ دل ہی عشق کا قیام گاہ ہے اور اسکے ہی سائبان تلے عشق پناہ گزیں ہے، تو یہ بھی سبب بن سکتا ہے عقل اور دل کی بلاواسطہ دشمنی کا۔ اس لیے عقل نے رُخِ دل پہ پردہ پوشی کر رکھی ہے، اتنی طویل ''رقابت'' کا یہی تو نتیجہ نکل سکتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی منہ دکھائی کے بھی روادار نہیں۔ میں نے ''رقابت'' لفظ اس لیے استعمال کیا کہ عقل کا بھی حاصلِ مقصد وہی ہے جہاں تک عشق پہنچ پایا ہے۔ مگر شیطانی وسوے اور فضول کے بحث، اسے کج رو کر دیتے ہیں اور وہ غلط راہ کا انتخاب کر لیتی ہے جس سے اسکی کوشش لاحاصل رہ جاتی ہے۔

دنیا میں اللہ نے جس طرح شیطان کو پیدا کیا (اپنے بندے کی بندگی کی استقامت کو پرکھنے کے لیے) اسی طرح عشق کے مدِّ مقابل عقل کو پیدا کیا۔ جب تک ہمارا کوئی compititor موجود نہ ہو تب تک ہمارا معیار، ہماری اہمیت اور قدر ومنزلت سے نہ ہم خود آگاہی حاصل کر سکتے ہیں اور نہ ہی دنیا ہمیں پہچان سکتی ہے۔ اس موضوع کو اقبالؔ نے اس طرح پیش کیا ہے:-

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ گلستاں کی جہاں گھات میں نہ ہو صیّاد

بحر حال یہ عقل اور عشق کا معرکہ ابتدا سے چلتا آرہا ہے، ہنوز جاری ہے اور مستقبل پر بھی اس کا غلبہ رہے گا، مگر عقل کی پرستش میں مبتلا دانشور اور فلاسفر جو ہمیشہ محوِ بحث رہتے ہیں اور انہیں لگتا ہے اس طریقے سے انہیں منزل مل جائے گی، تو وہ بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ ان کی یہ ساری کوشش لاحاصل اور بے سود ہے۔ اس لیے اکبرؔ یوں کہتے ہیں:-

صدیوں فلاسفی کی چناں و چنیں رہی
لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

انہیں صحیح معنوں میں منزل تک رسائی کے لیے عقل کے ذریعے دل پر پڑے غلاف کو ہٹانا ہوگا۔ اور دل کے راستے عشق کے سمندر میں غوطے لگانے ہوں گے۔ اسکی گہرائی یعنی انتہا میں پہنچ کر بے خودی کے عالم میں اپنے منزلِ مقصود کو سکتے ہے۔

۸:- آٹھویں شعر میں دردؔ نے یہ فرمایا ہے کہ عشق کی آگ پانی سے نہیں بجھ سکتی۔ یہ وہ آگ ہے جسے وصل کی لذت ہی ٹھنڈا کر سکتی ہے۔

اس شعر میں صنعتِ مراعات النظیر کا استعمال کر کے پہلے مصرعے میں ''اطفائے نارِ عشق'' کی مناسبت سے دوسرے مصرعے میں ''پانی'' لایا گیا ہے۔ اس میں غیر واقعیت بھی موجود ہے کہ عشق تو ایک اعلیٰ وارفع احساس ہے اور ایک احساس آگ کیسے ہو سکتا ہے۔ عشق کی بدولت عاشق کو جن جلن، تڑپ، بے چینی اور بے قراری کی اذیت خیز راہوں سے گزرنا پڑتا ہے اس کو آگ کے مماثل قرار دیا گیا ہے۔ اور نار یا آگ کو تمثیل کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

یہ تو رہا اس شعر کا ظاہری حسن، اب ہم اسکی معنوئی گہرائی میں اترنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عشق دو عالم سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اور اگر یہی عشق حقیقی ہو تو اس کا اقتضاء یہ ہوگا کہ محبوب جو وحدہٗ لاشریک ہے اس کے خلوت کدے میں بھی کوئی شریک نہ ہو۔ اس کے علاوہ دیگر آرزوؤں اور حسرتوں، تمناؤں اور مرادوں، خوشیوں اور غموں سے دل یکسر پاک ہو۔ اس پورے کائنات کی طرف سے آنکھیں بند ہو جائیں اور لو اسی ذاتِ واحد سے لگی رہے۔

امام غزالیؒ نے اپنے بیان میں حضرت رابعہ بصری کے چند اشعار کا ذکر کیا ہے کہ:-

''میں تجھ سے محبّت کرتی ہوں۔ دو طرح کی محبّت۔ ایک محبّت ہے آرزو اور تمنّا کی۔ اور دوسری ہے صرف تیری ذات کی۔ میری وہ محبّت جو آرزو اور تمنّا سے معمور ہے وہ تو کوئی اہمیت نہیں رکھتی لیکن وہ محبّت جو صرف تیری ذات سے ہے، تجھے اسی کا واسطہ حجاب کو دور کر دے تا کہ آنکھیں تیرا جلوہ دیکھ سکیں۔''

محبّت کا یہ تصوّر صوفیانہ شاعری میں خاص طور پر مقبول ہوا۔ خود دردؔ کی غزلیں محبّت کے اس تصوّر سے بھری پڑی ہیں۔ دردؔ کا ایک شعر:-

کھلا دروازہ از بس میرے دل پر اور عالم کا
نہ اندیشہ مجھے شادی کا ہے، نہ فکر ہے غم کا

یہ منتہائے عشق ہے جو صرف محبوبِ الٰہی کے وصل کا متقاضی ہے۔ تبھی نارِ عشق کو ٹھنڈک مل سکتی ہے۔ فراقِ محبوب میں آنسو بہانے سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کوئی بھی شئے بلا مقصد تخلیقِ عمل میں نہیں لائی گئی ہے۔ خالق نے ہماری تخلیق بھی ایک مقصد کے تحت کی ہے۔ ایک معین وقت کے لیے اس نے ہمیں خود سے جدا کیا ہے۔ اس دوران ہمیں اُس مقصد کو تلاش کرنا ہے اور اس پر عمل پیرا ہونا ہے۔ ساکت و ساکن رہ کر صرف فرقت کا رونا رونے سے کیا حاصل۔ ہم اگر عشق میں مبتلا ہیں تو محبوب کے تقاضے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا بھی لازمی ہے۔ یہی تو امتحانِ عشق ہے کہ عاشق کو اپنے معشوق کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کیسے کیسے مرحلے طے کرنے ہوتے ہیں۔ اقبالؔ یوں رقم طراز ہیں:-

آگ ہے، اولادِ ابراہیمؑ ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

ایک عاشق یہ سب کچھ کر گزرتا ہے اپنے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے۔ لذتِ شناسائی اور وصلِ محبوب سے ہی عشق کی آگ بجھ سکتی ہے اور بے چین اور بے قرار عاشق کو قرار مل سکتا ہے۔

۹:- اس شعر میں بے خودی کی حالت میں عشق کی انتہا کا ذکر ہے۔ اس میں صنعتِ تضاد یعنی ''بے خود'' اور ''بہ خود'' استعمال کر کے سکر کی حالت میں شرابِ بے خودی کے کرشمے پر روشنی ڈالی ہے۔

ابو یزید کے ایک معاصر یحییٰ بن معاذ الرازی، ابو یزید کو لکھتے ہیں:-

''میں شرابِ محبّت کے نشہ میں مدہوش اور سرمست ہوں، سرمستی اور مدہوشی کی وجہ یہ ہے کہ میں بہت زیادہ پی گیا ہوں۔''

یہ وہ شراب ہے جس نے منصور حلاج سے انا الحق کا ورد کروایا۔ اور اسی شرابِ عشق کے نشے میں سرِ دار بھی نغمہ خواں رہے۔ ذوالنون مصری کے نزدیک محبّت کا تقاضہ ہی یہ ہے کہ شرابِ عشق میں مست ہو کر اپنے کو محبوب میں فنا کر دیا جائے اور اپنی ذات کو اس کی ذات کا حصہ بنا دیا جائے۔ یہی وہ جذبہ ہے جس میں ڈوب کر غالب نے کہا:-

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

یہ بات اور ہے کہ آہستہ آہستہ اس مسلک نے یہ انتہا اختیار کی کہ شریعت اسے کفر و شرک سمجھنے لگی۔ یہاں میرا یہ بتانا مقصود ہے کہ شرابِ عشق کے نشے میں مست ہو کر عاشق خودی سے بے نیاز ہو جاتا ہے، اس کے اندر ایک حشر کا سا ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے۔ اسی سرشاری کے عالم میں عاشق عالمِ بے خودی تک رسائی حاصل کر لیتا

ہے۔اُس پر دنیا و مافیہا کی حقیقت کا انکشاف ہونے کے ساتھ ساتھ دین و دنیا کے راز و نیاز سے بھی پردہ اُٹھ جاتا ہے۔پھر عالمِ بے خودی کی وسعت کے سامنے اس دنیا کی حیثیت زرّہ برابر بھی نہیں رہتی۔یہی وجہ ہے کہ اس مرحلے سے واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔یہ وہ جام ہے جو عاشق و معشوق کی وصل کا سبب بنتا ہے۔عشقِ حقیقی کی انتہا تو یہی ہے۔حاصلِ عشق کا علم رکھنے والا عاشق عالمِ بے خودی سے واپسی یا ترکِ عشق کے جذبے سے یکسر عاری ہوتا ہے۔ حالؔی کا ایک شعر ملاحظہ ہو:-

ہوتی نہیں قبول دُعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو، دُعا میں اثر کہاں

وہیں شادؔ کا یہ شعر عشاق کے جذبوں کی ترجمانی اس طرح کرتا ہے:-

گلی میں یار کی اے شادؔ! سب مشتاق بیٹھے ہیں
خدا جانے وہاں سے حکم کس کے نام آئے گا

عاشق و معشوق کے درمیان حائل یہ فانی زندگی لذّتِ وصل کا مزہ نہیں چکھنے دیتی۔موت ہی اس دیوار کو مسمار کر عاشق کے مقصد کو بر لاتی ہے۔پھر اُسے اپنے ہونے کا احساس ہوتا ہے اور اپنے ہونے پر رشک بھی کرتا ہے۔یہ ہجر ہی ہے جو عاشق کو مجنوں بناتا ہے، وہ وصل ہی ہے جو اُسے خود سے ملاتا ہے۔یہاں حشر سے مراد موت ہے جو اُسے اس حالتِ زار سے نجات دلا سکتی ہے۔اور اُسے اُسکی منزل تک پہنچا سکتی ہے۔ورنہ اس فانی دنیا کی کوئی شئے عاشق کو اُس کے محبوب کی یاد سے غافل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

خواجہ میر دردؔ کو تقریباً تمام تذکرہ نگار اور تنقید نگاروں نے اردو کے بلند پایہ شاعروں کی فہرست میں ایک معتبر جگہ دی ہے۔آپ ایک خالص غزل گو شاعر ہیں۔آپ کی زندگی ہمیشہ ہوا و ہوس سے پاک رہی۔اسکی جھلک آپکی شاعری میں منعکس دکھائی دیتی ہے اور آپکی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اُجاگر کرتی ہے۔آپ کے دیوان کا ہر ایک شعر ایک نیا روحانی اور اخلاقی درس دیتا ہے۔اس لیے اُسے ''مثلِ کلامِ حافظ شیرازی سراپا انتخاب'' کی سند سے نوازا گیا ہے۔قدیر احمد کے اس قول پر اپنے اس تجزیے کا خاتمہ کروں گی:-

''اپنے بلند پایہ نظریۂ تصوّف، اپنی اعلیٰ ترین علم و آگہی، اپنی معیاری شاعری اور اصلاحِ زبان، ہر لحاظ سے خواجہ میر درد ایک پائنیر (pioneer) کی حیثیت رکھتے ہیں۔''

(بقیہ صفحہ:۴۲ کا)

بلکہ انہوں نے 5,000 سے زائد اردو امثال و محاورات، تعلیمی اسناد سرکاری و غیر سرکاری اداروں کے عربی مترادفات، 4000 سے زائد انگلش سارٹ فارم کا عربی ترجمہ اور مصر وغیرہ میں رائج علاقائی زبان پر مشتمل ضمیموں کو شامل کر کے اس ڈکشنری کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔ڈکشنری کے آخر میں شامل یہ ضمیمے اپنی اہمیت وافادیت کے لحاظ سے کافی اہم ہیں۔

ڈکشنریوں میں عام طور پر ایک ہی لفظ کے رائج دو املا میں سے کسی ایک کو ہی شامل کیا جاتا ہے دوسرے املا کے آگے ''دیکھیں.....'' لکھ دیا جاتا ہے حالانکہ اس جگہ پر اس لفظ کا معنی بھی لکھا جا سکتا ہے۔ازہری صاحب نے ایسے الفاظ کا عربی متبادل سبھی جگہوں پر دیا ہے۔اس سے قاری کو سہولت ہوگئی ہے۔اردو میں رائج انگریزی الفاظ کو بھی شامل کر کے ان کا عربی متبادل دیا گیا ہے۔ایسی جگہوں پر عام طور پر انگریزی رسم الخط میں بھی اس لفظ کو لکھ دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر محمد زکریا ازہری کو عربی اور اردو دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہے۔انہوں نے جامعہ ازہر کے اساتذہ سے عربی زبان وادب کی تعلیم پائی ہے۔اردو ان کی مادری زبان ہے۔ان کی یہ مہارت اس ڈکشنری کی ہر سطر سے عیاں ہے۔

ڈکشنری میں شامل ڈاکٹر عبدالماجد، استاد شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ، دکتور جلال سعید الحفناوی استاد برائے اردو ادب، جامعہ قاہرہ و جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ اور دکتور ایمن عبدالحلیم مصطفیٰ احمد، استاد شعبہ برائے مشرقی زبان کے وقیع مقدموں نے ڈکشنری کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔

خوب صورت ٹائٹل، بہترین کاغذ پر مضبوط اور عمدہ جلد کے ساتھ شائع اس ڈکشنری کی قیمت واجبی ہے جو عام طلبہ بھی آسانی سے خرید سکتے ہیں۔ڈاکٹر محمد زکریا ازہری پوری اردو اور عربی برادری کی طرف سے مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے وہ کام کر دکھایا جو پوری ایک ٹیم کا تھا۔امید کی جاتی ہے اس کتاب کو اساتذہ، طلبہ اور مترجمین میں یکساں مقبولیت حاصل ہوگی۔

حکیم صوفی سید شاہ محمد خیر الدین قادری صوفی
حیدرآباد

حضرت سید نصیر الدین شاہ چراغ دکن علیہ الرحمہ

نظام کائنات ابتداء سے چلتا آرہا ہے اور تا قیامت چلتا ہے رہے گا، اس نظام میں تبدیلیاں آتی ہیں موسم، صدی اور ماہ وسال ،رات دن بدلتے رہتے ہیں، ان تمام ظاہری بدلاؤ کے باوجود کائنات کی حقیقت اور اوصاف نہیں بدلتے، بارش کا موسم پانی ہی برساتا ہے۔ جاڑوں میں سردی ہی آتی ہے، گرما شدت ہی لاتا ہے، حالانکہ سال، صدی، وقت ،لوگ ،آبادیاں، شہر بدل گئے جو آباد تھے کھنڈر ہوگئے جو کھنڈر تھے وہ آباد ہوگئے جو نہیں تھے وہ آگئے جو تھے وہ چلے گئے وہ دوبارہ نہیں آئیں گے جو آرہے ہیں وہ پہلے نہیں آئے اس کے باوجود کائنات کا نظام جاری وساری ہے اس نظام کائنات کی تبدیلیوں کو ہر کوئی سمجھ نہی سکتا اور اسی حقیقت کو نہیں جان سکتا اور وہی امید رکھی جاتی ہے جو اس کی حقیقت ہے۔

اس طرح خالق کائنات اپنے نظام کائنات میں بھی تبدیلیاں لاتا ہے لیکن ابتداء دنیا سے چند ایسے محبوب بندوں کو منتخب کیا جو اللہ کی مرضی کے مطابق بندوں کو اللہ سے جوڑے اور درمیان میں جو راہ ابلیس بھی ہے اس سے بچاتے ہوئے راست اللہ تک پہنچنے کا راستہ دکھائے، بظاہر شخصیات بدلی ہیں لیکن کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کا یعنی حضرت آدمؑ سے تاجدار دوعالمؐ تک کا ایک ہی مقصد تھا کہ لوگ ایک اللہ کو پہچانیں۔ خاتم النبیینؐ کے بعد سلسلہ انبیاء ورسل موقوف ہوگیا لیکن بندگان خدا کی رہبری کو جاری رکھنا تھا جو کام انبیاء کے سپرد تھا وہ عظیم کام آقائے نامدار محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے منتخب بندوں کے سپرد کیا گیا جس کو ہم عرف عام میں اولیاء کہتے ہیں مقصد کام وہی ہے، لیکن شخصیات تبدیل ہوتی گئیں یہ سلسلہ صحابہ کرام سے بالخصوص حیدر کرار حضرت علی ابن طالبؓ سے ہوتا ہوا آل نبی اولاد علی میں حضور غوث وخواجہ اعظم غریب وغیرہ سے ہوتا ہوا تسلسل کے ساتھ دکن میں حضرت سید نصیر الدین قادری نجفی شاہ چراغ دکن تک پہنچتا ہے۔

آپ 570 رسال قبل نجف اشرف سے اس وقت تشریف لائے جب حیدرآباد کا وجود بھی نہیں تھا۔

اس علاقے کو موضع چنچلم کہا جاتا تھا آج بھی علاقہ بلدہ اسی نام سے درج ہے، اس موضع میں صرف برہمن لوگ آباد تھے، حضرت اسی بستی میں قیام کیا اور اپنی منصبی ذمہ داری تبلیغ اسلام شروع کیا، ہر اچھے کام میں دشواریاں ہوتی ہیں چنانچہ آپ کو بھی اس کا سامنا کرنا پڑا لیکن آپ کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی آپ بے تکان اسلام کی دعوت دیتے تھے اور اپنے عمل وکردار سے لوگوں کو اسلام کی حقانیت سے واقف کرواتے رہے اللہ والوں کی شان ہوتی ہے کہ اپنے زبان یا قلم سے کسی بندے کا دل نہیں دکھاتے اپنے کردار سے اسلام کی حقیقت کو واضح کرتے ہیں ریا کاری عیش پرستی ہے ان کے قریب بھی نہیں آتی ان کی زندگی کتاب اللہ اور سنت رسول کے مطابق ہوتی ہے اور اللہ کے بندوں کی خدمت کرنا ان کا مقصد حیات ہوتا ہے چنانچہ حضرت شاہ چراغ دکن علیہ الرحمہ ان اوصاف حمیدہ سے مالا مال تھے انہیں اوصاف سے متاثر ہوکر آپ کے مخالفین بھی آپ گرویدہ ہوگئے اور دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے حضرت سید معین الدین قادری کو اپنی تصنیف اولیاء حیدرآباد میں لکھتے ہیں حضرت بابا شرف الدین سہروردی اور حضرت سید احمد بارہاؒ کے بعد سب سے بڑی شخصیت حضرت شاہ چراغ دکن کی ہے جو حیدرآباد تشریف لائے نماز پنجگانہ کے علاوہ کثرت سے نوافل ادا کرتے اور بیشتر حصہ تلاوت کلام اللہ پر صرف کرتے۔ آج آپ کا مزار جہاں پر ہے اس مقام کو دائرہ میر مومن کے نام سے جانا جاتا ہے جناب مراد علی طالع اپنی کتاب اولیاء دکن میں لکھتے ہیں حضرت شاہ چراغ اور میر مومن کا زمانہ ایک سو پچاس سالہ درمیانی ہے حضرت میر مومن اس مقام پر دو عظیم سپوتوں کی موجودگی (حضرت شاہ چراغ اور حضرت سید نور الہدی کو اپنے لیے متبرک جان کر اس مقام کو منتخب کیا چونکہ حضرت میر مومنؒ سلطنت قطب شاہی کے پیشوا تھے اسی بنیاد پر یہ علاقہ میر مومن کے نام سے مشہور ہوگیا۔ (جاری ہے)

ڈاکٹر بلال احمد میر
یونی ورسٹی آف حیدرآباد (شکارگاہ ترال پلوامہ (کشمیر)

حکایتوں اور لوک کہانیوں میں حظ وانبساط کا پہلو

Merrimental facets in anecdotes and folk stories ever keeps the intrersts of reader live,it is merrimental facet that removes boredom from reader.every oral and written literature's success depends on merrimental facets

لوک سے کیا مراد ہے۔قدیم سماج میں تو اس سارے افراد 'لوک' کہلاتے تھے۔اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دنیا کے کسی بھی ملک میں بسنے والے مہذب سے مہذب افراد کو ''لوک'' کہا جاسکتا تھا۔لیکن جب ہم ''لوگ ادب''

folk literature جو بہت سارے چیزوں سے تیار ہوتا ہے ان چیزوں میں لوک گیت، لوک سنگیت، لوک نرتیہ، لوک کلا، ہیں۔لوک کا مفہوم کچھ محدود سا ہو جاتا ہیں۔اور وہ بھی انہی لوگوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔جو جدید تہذیب وتمدن اور تعلیم کے سرچشموں سے کوسوں دور ہیں۔جو کم پڑھے لکھے جنہیں الفاظ کی معمولی سی جان پہچان ہے وہ 'عین غین' اور 'شین قاف' جیسے الفاظ کے صحیح تلفظ سے بھی آشنا ہیں، یعنی کم سواد، نا خواندہ، ان پڑھ، گنوار اور دیاتی، انھی افراد کو ''لوک ادب'' کی اصطلاح میں لوک کہا جاتا ہے اور اسی کوک میں مروّج وہ ساری کہانیاں جو صدیوں سے سینہ بہ سینہ نسل در نسل، ایک منہ سے دوسرے منہ تک پہنچتی ہے چلی آرہی ہے ''لوک کتھائیں یا لوک کہانیاں'' کہلاتی ہیں۔لوک کہانیوں اور ادبی کہانی میں فرق اتنا ہوتی ہے کہ لوک کہانی زبانی محفوظ ہوتی ہے جبکہ ادبی کہانی تحریری صورت میں ہوتی ہے۔

دوسری زبانوں کہانیوں کی طرح دکنی اردو ادب میں بھی صدیوں سے بچوں کی کہانیوں کا چلن رہا ہے ان میں سے کچھ کہانیاں منظوم ہیں اور کچھ نثر میں ہیں۔منظوم کہانیوں میں، بڑھیا اور جھنگے کی کہانی، ہرنی کی گیت کتھا، اور چوہے بلی کی کہانی، مقبول ہے۔نثری کہانیوں میں ایک تھا کوّا، ایک تھی شارد ماں، اور چاند سورج کی کہانی، ان سب کہانیوں میں حظ اور انبساط کثرت سے موجود ہیں۔دکنی کہانیوں کے حظ وانبساط کے بارے میں ابراہیم فیض یوں رقم طراز ہے۔

دنیا کی لوک کہانیوں کی طرح دکنی اردو کی لوک کہانیوں کا مقصد بھی تفریح اور خالص تفریح ہی رہا ہے۔لیکن ہر تفریحی کہانی کے ساتھ ساتھ پند ونصیحت کا جوڑ بھی ہے۔''[1]

حکایت یا قصّے میں حظ یا انبساط کا پہلو قاری کی دلچسپی کا باعث ہوتا ہے۔کیوں کہ یہ پہلو قاری کی بیزاری یا اکتاہٹ کو دور بھی کرتا ہے اور وہ اس کی محویت کا باعث بھی بنتا ہے۔چناں چہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نوعیت کی زبانی اور تحریری نگارشات کی کامیابی کے پیچھے حظ اور انبساط کا پہلو ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔

تفریح یا دل بہلانا ہی قصہ گوئی کا مقصد رہا ہے۔اگر کسی کہانی میں تفریح کا سامان نہ ہو، اس کے سننے سے دل بہلتا ہے نہ مسرت حاصل ہوتی ہے اور نہ بصیرت۔وہ چاہے کچھ بھی ہو مگر کہانی نہیں ہوسکتی۔چناں چہ حکایتوں میں سنجیدگی، تفریح، مزاح کے ساتھ ساتھ حظ اور انبساط کا عنصر بھی کارفرما ہوتا ہے۔یہ اس کا جزو لاینفک ہوتا ہے۔کرشن چندر نے کہانی کی کہانی سناتے ہوئے کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے:

'آج سے ہزاروں سال پہلے کی کہانی رات کے سناٹے میں کہی گئی تھی۔اندھیارے کا خوف مٹانے کے لیے دل بہلانے کے لیے بڑوں کا دل بہلانے کے لیے، بچّوں کے دل میں زندگی سنہرا تخیل جگانے کے لیے، ماں کی مہربانی گود میں انہیں سلانے کے لیے چوفؔ، موپاساں، مام، پریم چندر، منٹو، اور بیدی بعد میں آئے، پہلے تو ایک خاتون آئی تھی۔اسی کی روایت سے دکن کے خاتون نے بھی کہانی سنانے والی خاتون کی روایت برقرار رہی۔دکنی اردو تفریحی کہانیوں کی تعداد بے شمار ہے۔ان میں عبداللہ دیوانہ تمیں مارخان، بولتا سیار، اور وزیر ہنسے گا تو پانی برسے

گا جیسی ہی بڑی لوک کہانیاں ہیں۔''۲

حکایت اپنے اندر انبساط کا عنصر رکھنے کے باوصف حکمت کا وہ علم عطا کرتی ہے، جس کے حاصل کرنے میں دہائیوں کا سفر طے کرنا پڑتا ہے۔ جیسے مولانا رومؔی کی ایک حکایت۔ ''شیخی خور کی مونچھیں'' میں انبساط کا عنصر حکمت کے ایک لطیف پہلو کے ساتھ نمایاں ہے۔اس حکایت میں ایک بچّہ دوڑ کر دولت مندوں کی محفل میں آتا ہے اور اپنے باپ سے چیخ چیخ کر کہتا ہے کہ رنبے کی چکنی کا وہ ٹکڑا جس سے آپ روزانہ اپنی مونچھیں چکنی کرتے تھے ایک بلّی منہ میں دبا کر چلی گئی ہے۔ میں نے اُسے پکڑنے کی پوری کوشش کی مگر وہ وہاں سے بھاگ گئی۔ بچّے کے یہ کلمات سن کر ساری محفل ہنس پڑتی ہے اور اس آدمی کا رنگ اڑ جاتا ہے اور وہ شرمندہ ہوتا ہے۔اس سے انبساط کا پہلو نمایاں تو ہے مگر دیکھا جائے تو یہ حکایت کسی کی نمائشی زندگی کے خلاف ایک جنگ بھی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ لوک ادب کا بڑا سرمایہ ماضی کی تصویریں پیش کرتا ہے۔لیکن ان تصویروں کی بازیافت کے بغیر حال کا نہ کوئی خاکہ بن سکے گا اور نہ اس سے کسی روایت سے وابستہ کیا جائے گا۔حکایتوں میں اس کے برعکس ہوتا ہے۔لیکن حکایتوں سے ہم حال اور مستقبل کی تعمیر کر سکتے ہیں۔دکنی لوک کہانیوں کی طرح دکنی اردو کی کہانیوں کا مقصد بھی تفریح اور خاص کر انبساط رہا ہے۔تاہم ہر کہانی میں تفریح کے ساتھ پند و نصیحت کا جوڑ بھی ہوتا ہے۔جیسے کہ مولانا رومی کی ایک اور حکایت ''قیاس آرائی'' ہے، جس میں حظ کے ساتھ ساتھ خوشی کی لہریں انسان کو مسرت سے نوازنے کے ساتھ نصیحت سے بھی سرفراز کرتی ہے۔حکایت کچھ اس طرح ہے۔ایک دوکان دار نے ایک نہایت ہی خوب صورت توتا پال رکھا تھا۔ وہ بڑی میٹھی میٹھی گفتگو کرتا تھا۔ایک وقت کی بات تھی کہ دوکان دار کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔اسی اثناء میں ایک بلّی چوہے کا پیچھا کرتی ہوئی دوکان میں آ گئی۔ توتے کو لگا کہ بلّی اس کو مار کھائے گی۔ چناں چہ وہ اپنی حفاظت کرنے کے لیے ادھر ادھر پھڑ پھڑانے لگا، جس کی وجہ سے بادام کے تیل کی کچھ بوتلیں نیچے گر کر ٹوٹ گئیں اور تیل سارے دکان میں پھیل گیا۔ جب دکان دار واپس آتا ہے تو توتے کو مار مار کر گنجا بنا دیتا ہے۔اس کے بعد توتا بولنا بند کر دیتا ہے۔جس کی وجہ سے دکان دار شرمندہ ہوتا ہے۔کافی دیر تک توتا کچھ نہیں بولتا۔ دکان دار کے لاکھ جتن کرنے پر بھی وہ نہیں بولتا اور اس کی مہرِ سکوت نہیں ٹوٹتی۔ایک دن ایک درویش اپنے ابرووں کو منڈا کر خدا مست کی دکان کے سامنے سے گزرتا ہے۔توتے نے جو نہی اس گنجے فقیر کو دیکھا بلند آواز میں بولا ''سائیں تو کس سبب گنجا ہوا؟ کیا تو نے بھی بوتل سے تیل گرا دیا تھا؟''۔توتے کی اس بات کو سن کر وہاں موجود لوگ ہنس پڑتے ہیں کہ اس نے درویش کو بھی اپنے جیسا سمجھ لیا ہے۔اس حکایت سے یہ سبق ملتا ہے کہ تحقیق کیے بغیر کسی کے متعلق یونہی قیاس آرائیاں نہیں کرنا چاہیے۔

ہندوستان دنیا کا وہ واحد ملک ہے جہاں کہانیاں سنانے کا شوق ایک فن کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ ہندوستان ہی سے پارس کے باشندوں نے یہ فن سیکھا اور اسے عربستان کی سرحدوں کے اندر پہنچا دیا۔مشرق وسطی سے داستان گوئی نے قسطنطنیہ اور وینس کی وادی تک کا سفر کیا اور پھر انگلستان اور فرانس تک جا پہنچی۔اگرچہ ان کہانیوں نے ہر ملک میں وہاں کی مقامی زندگی اور حالات کی جزئیات کو اپنے اندر سمو لیا۔لیکن ان میں جو ہندوستانیت کا مزاج تھا وہ کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا۔

''کتھا سرت ساگر'' دنیا کی اولین کہانیوں کا ایک ضخیم مجموعہ ہے۔ یہ بیانیہ شاعری پر مبنی ہے۔ جسے آسان مگر شستہ نظم میں قلم بند کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس میں کئی کہانیاں ہیں۔لیکن سوم دیو نے مرکزی داستان کی جزئیات کو اول تا آخر برقرار رکھا ہے۔ان کہانیوں میں مزاج کے دوش بدوش حظ اور انبساط کے پہلو نمایاں ہیں۔شارؔ کا منش کی زبان میں ''ان کہانیوں میں شاندار معیار اور دل نشیں انداز بیان موجود ہے۔'' لوک ادب تحریر کرنے والوں نے دنیا بھر میں ان کہانیوں سے استفادہ کیا ہے۔کتھا سرت ساگر'' میں ایسی کہانیاں ہیں جو مزاح کے ساتھ ساتھ انبساط کا وہ پہلو اپنے اندر رکھتی ہیں جو حظ کے ساتھ عقل اور دانائی تک رسائی بہم پہنچاتی ہیں۔

''کتھا سرت ساگر'' کی ایک کہانی میں شہزادہ نرواہن دت چھبیس بیویوں کو جیت کر جادوگروں کا بادشاہ بن جاتا ہے۔اس کہانی میں بادشاہ بن جانے تک ہزار ہا بار مزاح کے ایسے شگوفے پھوٹتے ہیں اور انبساط سے ماحول کے ہر گوشے کو زعفران زار بنا دیتا ہے۔کتھا سرت ساگر کے کہانیوں کے بارے میں شار کا منش یوں رقم طراز ہیں:

''ان کہانیوں میں شاندار معیار اور دل نشین اندازِ بیان موجود ہے'' لوک ادب کرنے والوں نے دنیا بھر میں ان کہانیوں سے

استفادہ کیا اور کر رہے ہیں۔'' ۳؎

ایک اور کہانی میں وارا روچی نامی شخص جب گھر سے باہر جاتا ہے۔تو کئی معزّز ہستیاں اس کی خوبصورت بیوی اپاکوشا پر ڈورے ڈالنے لگتے ہیں ۔ وہ ان مردوں کو سبق سکھانا چاہتی ہے ۔چناں چہ ایک دن وہ ان مردوں کو الگ الگ بلا کر کمالِ ہوشیاری کے ساتھ پہلے ان کو مادر زاد ننگا کراتی ہے پھر چراغ کے دھویں کی کالک اُن کے مُنہ پر ملتی ہے۔اس کے بعد انہیں اسی حالت میں الگ الگ الماریوں میں بند کر دیتی ہے۔ جب اس کا شوہر وارا روچی واپس آتا ہے تو ان کی یہ حالت دیکھ کر ہنس پڑتا ہے۔پھر یہ سارے مرد انکساری کرتے ہیں اور بچوں کی طرح روتے بلکتے ہیں۔ان کی یہ ہئیت کذائی دیکھ کر ہنسی کی بارشیں سارے ماحول کو ہنسی سے تر کر دیتی ہیں۔انبساط کے اس پہلو کے ساتھ بھی کہانی کا ماحصل یوں نکلتا ہے کہ کوئی بھی شخص غلط کاری سے خوش نہیں رہ سکتا۔

ہر چند ''پنچ تنتر'' کی کہانیاں بادشاہ وقت امر شکتی نے اپنے بیٹوں کے لیے وشنو شرما سے لکھوائی تھیں ۔مگر اُسے یہ یقین نہ تھا کہ محض ایک کتاب کی وجہ سے اُس کے تین جاہل بیٹے سدھر جائیں گے اور انھیں عقل وشعور کی دولت مل جائے گی۔مگر یہ کتاب نہ صرف اس کے بیٹوں کے کام آتی ہے بل کہ آج تک اس کی اہمیت برقرار ہے۔اس کی کچھ حکایتیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔

پانچویں تنتر میں ایک کہانی ''ڈھپور شنکھ'' ہے جس میں ایک غریب برہمن اپنی جان لیوا مفلسی اور اپنے بچوں کی حالت زار کو دیکھ کر سمندر کی اور نکل پڑتا ہے۔وہاں اُسے لوگوں کی ایک بات یاد آتی ہے کہ سمندر میں بے شمار ہیرے اور جواہرات ہوتے ہیں۔یہ بات یاد آتے ہی وہ غریب برہمن سمندر کے کنارے پر دھونی رما کر پوجا پاٹ میں مصروف ہو جاتا ہے۔اُسے یقین تھا کہ یہ سمندر اُسے کچھ نہ کچھ دے کر اُس کی غریبی دور کر دے گا۔چناں چہ وہ شب و روز عبادت کرنے لگا یہاں تک کہ وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔اس کے باوجود اس نے اپنا ارادہ نہیں چھوڑا۔ایک دن سمندر کو اس پر ترس آ گیا۔لہٰذا وہ بھیس بدل کر اس کے پاس چلا آیا اور برہمن سے دریافت کیا کہ وہ کیوں یہاں آیا ہے اور یہ کڑی عبادت کیوں کر رہا ہے؟ برہمن نے اُسے سب کچھ بتایا۔سمندر نے جب برہمن سے اس کی مفلسی کی داستان سنی تو اس نے برہمن کے ہاتھ میں ایک شنکھ تھما دیا اور کہا کہ وہ ہر روز اس کو پوجے جس سے اس کو ہر روز ایک مہر مل جائے گا۔ برہمن نے شنکھ لیا اور گھر کی طرف چل پڑا۔ چلتے چلتے راستے میں رات ہو گئی۔ برہمن نے سوچا کہ کیوں نہ آج رات کسی قریے میں گزار لی جائے۔ کچھ دیر چلنے کے بعد اُسے ایک قریہ ملا۔اُس نے وہاں کسی کے یہاں رات گزارنے کا ارادہ کیا اور جلد ہی اسے ایک بنیے کے یہاں ٹھہرنے کی سہولت مل گئی۔ برہمن صبح اُٹھا اور شنکھ کی پوجا کرنے لگا۔ سمندر کا کہنا سچ نکلا،شنکھ سے ایک مہر نکلا۔ برہمن تو خوش ہو گیا مگر دوسری طرف بنیے پر یہ راز افشا ہو گیا اور اس کی نیت میں فتور آ گیا۔ چناں چہ اس نے جادوئی شنکھ کو اپنے معمولی شنکھ سے بدل لیا۔ جب برہمن گھر پہنچا تو اس نے اپنے گھر والوں کو یہ خوش خبری سنائی تو سب خوش ہو گئے۔مگر جب اس نے دوبارہ اس شنکھ کی پوجا شروع کی تو اس شنکھ سے کچھ نہ نکلا تو اس کے اہلِ خانہ نے اس کا مذاق اڑایا۔چناں چہ وہ غریب آدمی دوبارہ سمندر کے پاس گیا اور سمندر سے آہ وزاری کی۔سمندر ایک بار پھر اس کے پاس بھیس بدل کر آ کھڑا ہوا اور اس کا حال دریافت کیا۔ برہمن نے سارا ماجرا سنایا اور اس رات کے قیام کے بارے میں بتایا جس پر سمندر سمجھ گیا کہ یہ لٹ چکا ہے۔ چناں چہ سمندر نے ایک نیا شنکھ دیا اور کہا کہ اس کو پوجتے وقت یہ کہنا کہ ایک مہر دے۔شنکھ بولے گا کہ ایک کے بجائے دس ہزار مہر لے لو۔ یہ بات سن کر لالچی آدمی دس ہزار مانگے گا مگر شنکھ اُسے کچھ نہیں دے گا۔ برہمن وہاں سے واپس آیا اور پھر ایک بار بنیئے کے یہاں رات گزاری اور حسبِ معمول صبح اٹھ کر منہ ہاتھ دھو کر شنکھ کی پوجا کرنے لگا اور شنکھ سے کہتا ہے مہاراج مجھے ایک ہزار مہریں دیجیے جس پر شنکھ نے کہا کہ وہ ایک ہزار نہیں دس ہزار مہریں دے گا۔یہ سنتے ہی بنیئے نے پہلے والے شنکھ سے نیا شنکھ بدل لیا۔اس کے بعد غریب برہمن گھر پہنچ کر شنکھ کی پوجا کرتا ہے اور ہر روز ایک مہر حاصل کرتا ہے جس سے اُس کی غریبی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہاں بنیا ہر روز شنکھ کی پوجا کرتا ہے اور دس ہزار مہروں کی مانگ کرتا ہے۔تاہم شنکھ اُس سے وعدہ تو کرتا ہے مگر اُسے ایک مہر نہیں دیتا ہے۔جب بنیا اس شنکھ کی پوجا کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو شنکھ اس سے بولتا ہے کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ میں بول تو سکتا ہوں لیکن کچھ دے نہیں سکتا۔تب گھر والے اس پر ہنستے ہیں جس سے اس کو اپنی لالچی فطرت پر غصہ آتا ہے۔اسی لیے کہا گیا ہے کہ لالچ بری بلا ہے۔لالچ ہرگز نہیں کرنی چاہیے اور اللہ جس حال میں رکھے اس میں خوش رہنا چاہیے

پنچ تنتر کی کہانیاں چرند پرند کے ارد گرد ہی گھومتی ہیں جن

میں بڑے دلکش پیرائے میں سیاست، اخلاق، دنیا داری اور عدل و انصاف کے اوصاف اور اصولوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کہانیاں صرف راجا کے لیے ہی نہیں تھیں بلکہ اس میں انسانیت کا وہ پیغام دیا گیا ہے جس کو ہر وقت ہر معاشرہ اور ہر فرد قابلِ فخر سمجھتا ہے۔ اس میں ایک اور مشہور کہانی بھی شامل ہے جس میں ایک بار مگر مچھ نے ایک بندر سے دوستی گانٹھ لی اور وہ اسے ایک لذیذ میوہ کھلاتا ہے۔ ایک دن مگر مچھ نے یہی میوہ اپنی بیوی کو کھلایا تو اسے اس کی لذّت اس قدر بھا گئی کہ جب اسے پتہ چلا کہ بندر روز یہی میوہ کھاتا ہے تو اس سے خیال آیا کہ پھر بندر کا کلیجہ یہ میوہ چکھ چکھ کے بے حد لذیذ بن چکا ہوگا۔ اس نے مگر مچھ سے فرمائش کی کہ وہ بندر کا کلیجہ نکال کے کھلا دے ورنہ وہ خودکشی کر لے گی۔ مگر مچھ نے اپنی بیوی کی فرمائش پوری کرنے کے لیے ایک دن بندر کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کر سمندر کی سیر کرا کر بیچ سمندر میں بندر سے اس کی بیوی کی فرمائش ظاہر کی کہ وہ ان کا کلیجہ نکال کر اس کی بیوی کو کھلائے گا۔ مگر ہشیار بندر نے ہمت نہ ہاری اور حوصلہ اور ہشیاری سے کام لیتے ہوئے مگر مچھ سے کہا۔ ''بھائی تم تو میرے جگری دوست ہو۔ میرا کلیجہ کیا میری جان بھی تمہاری بیوی کے لیے حاضر ہے۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ میں اپنا کلیجہ اسی درخت پر چھوڑ آیا ہوں جس پر میں رہتا ہوں۔ اگر تم نے پہلے بتایا ہوتا تو میں اسے ساتھ لے کر آجاتا۔'' مگر مچھ نے اس پر بھروسہ کیا اور واپس کنارے پر چھلانگ لگائی اور درخت پر چڑھ کر اپنی جان بچائی۔ اس سے انبساط کا ایسا ماحول چھا جاتا ہے۔ حظ کے ساتھ یہاں یہ سبق ملتا ہے کہ ایک خونخوار اور ان جانے شخص پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔

حکایتوں اور لوک کہانیوں میں عوام کی ذہانت کا تخلیقی اظہار بھی ہوتا ہے اور ان کی تفریح و تفنن کا ذریعہ بھی۔ اس میں ہنسی مذاق، ٹھٹھول، طنز و تعریض، مذہبی عقیدت، دشمنوں سے نفرت، وطن دوستی، مظاہرِ فطرت سے محبت جنسی جبلت، الغرض ہر طرح کے جذبات، احساسات اور واردات کا اظہار ہوتا ہے۔

''چڑے چڑیا'' کی کہانی بھی ظرافت کا لبادہ اوڑھے ہوئی ہے، جس سے ہر کوئی سننے والا خوشی سے جھوم اٹھتا ہے۔ اس کہانی میں چڑیا دال کا دانہ لاتی ہے اور چڑا چاول کا دانہ دونوں مل کر کھچڑی پکاتے ہیں اور چڑیا چڑے کو پانی لانے کے بہانے بھیج کر خود ساری کھچڑی کھا لیتی ہے اور جب چڑا واپس آتا ہے تو آنکھوں کے دکھنے کا بہانہ کر کے اس کی باتوں کو سنی ان سنی کر کے جا سو رہتی ہے۔ جب دونوں میں قسما قسمی ہوتی ہے تو کچّے سوت کے ڈورے کا جھولا کنویں میں ڈال کر جھولتے ہی جھوٹی چڑیا گر پڑتی ہے۔ کنویں کے منڈیر پر چڑا اداس بیٹھا ہے ایک بلّی اس شرط پر چڑیا کو کنویں سے نکالنے پر آمادہ ہوتی ہے کہ آدھی چڑیا وہ لے لے گی۔ بلّی چڑیا کو نکال لاتی ہے اور اپنا حصّہ طلب کرتی ہے۔ چڑا کہتا ہے، چڑیا ذرا سوکھ جائے تو آدھی آدھی کر لیں گے لیکن جیسے ہی اس کے پر سوکھ جاتے ہیں وہ دونوں پھُر سے اڑ جاتے ہیں اور بلّی منہ دیکھتی رہ جاتی ہے۔ یہ کہانی بھی گھریلو زندگی کے نوک جھونک، نر اور مادہ کے جو رشتے اور چالاکیاں بھی ہیں اور عوامی معاشرے کے عام سماجی طور طریقے بھی قسم کی حرکت اور جھوٹے کی سزا اور پھر اس سزا سے بچنے کے لیے چالاکی۔ سبھی ایسی حکمت عملی کی مثالیں ہیں جو معاشرے کے اقدار کی نشان دہی کرتی ہیں۔

شیخ سعدی کی حکایتیں بھی اپنے اندر لاکھوں مضامین لیے ہوئے ہیں۔ ان میں انبساط کے کئی پہلو پوشیدہ ہیں۔ ''شیر بہت بیمار ہے'' انبساط کے رنگ میں رنگی ہوئی ایک حکایت ہے۔ ایک شیر بڑھاپے کی وجہ سے کمزور ہو جاتا ہے اور خود سے شکار کرنے کے قابل نہیں رہتا تو ایک لومڑی سے مشورہ کرتا ہے۔ اس پر لومڑی نے کہا ''تم فکر نہ کرو، میں اس کا بندوبست کرتی ہوں۔'' یہ کہہ کر لومڑی نے سارے جنگل میں مشہور کر دیا کہ شیر بہت بیمار ہے اور بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ یہ خبر سنتے ہی جنگل کے تمام جانور اس کی عیادت کے لیے آنے لگے۔ شیر غار میں گردن لٹکا کر بیٹھا رہا اور ہر جانور کو باتوں باتوں میں ہنساتا اور پھر اس کا شکار کرتا رہا اور یوں اپنی بھوک کو مٹاتا رہا۔ ایک دن یہی لومڑی اس کی عیادت کے لیے آتی ہے۔ لومڑی بہت چالاک تھی اس لیے غار کے دہانے پر کھڑی ہوگئی۔ اتفاقاً اس دن کوئی جانور نہیں آیا تھا۔ جس کی وجہ سے شیر بہت بھوکا تھا۔ اس نے لومڑی سے کہا ''باہر کیوں کھڑی ہو اندر آجاؤ اور مجھے جنگل کا حال و احوال سناؤ'' لومڑی نے چالاکی سے جواب دیا'' نہیں میں اندر نہیں آسکتی۔ کیوں کہ غار کے باہر اندر جانے والے جانوروں کے پنجوں کے نشان تو ملتے ہیں مگر اندر سے باہر آنے والے جانوروں کے نشان نہیں ملتے۔ شیر اور لومڑی دونوں ہنسنے لگے اور لومڑی نے اپنے آپ کو بچایا اور وہاں سے بھاگ گئی۔ دونوں کی چالاکی اور ہنسے سے ماحول خوشی سے معطر تو ہوتا ہی ہے مگر اس کے ساتھ کہانی کا حاصل اس صورت میں ہمیشہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ انجام پر نظر رکھنے والے ہمیشہ ہر قسم کے نقصان سے محفوظ رہتے ہیں۔ (بقیہ صفحہ ۲۲ پر)

رحمٰن جامی

رمضان کے روزے

پیاسوں کی حسیں پیاس ہیں رمضان کے روزے
نیکوں کو بڑے راس ہیں رمضان کے روزے
بھوکے رہیں پیاسے رہیں مقصد یہ نہیں ہے
قربانی کا احساس ہیں رمضان کے روزے
دوزخ کی اسے آگ جلا ہی نہیں سکتی
جس شخص کے بھی پاس ہیں رمضان کے روزے
بخشائیں گے مومن کو قیامت میں یقیناً
بخشش کی بڑی آس ہیں رمضان کے روزے
اللہ کا وعدہ ہے تو جنت بھی ملے گی
فردوس کی بو پاس ہیں رمضان کے روزے
بدبخت ہیں وہ لوگ جو روزے نہیں رکھتے
بھوکوں کو کہاں راس ہیں رمضان کے روزے
مفلس کے لیے اس بڑی ہے کوئی دولت؟
یہ گوہر والماس ہیں رمضان کے روزے
جنت میں بلا کھٹکے پہنچ جائے گا جامؔی
پروانۂ انفاس ہیں رمضان کے روزے

اعتکاف

اللہ کو منانے کا فن اعتکاف ہے
اپنا اسے بنانے کا فن اعتکاف ہے
مانگو تم اس سے بعد جو چاہو ملے گا پھر
ہاں اس پہ حق جتانے کا فن اعتکاف ہے

زکوٰۃ

اپنی کمائی پاک کریں دیں زکوٰۃ دیں
دے کر اڑھائی پاک کریں دیں زکوٰۃ دیں
جنت میں کام آئے گی جامؔی یہی زکوٰۃ
ہاں خود کو بھائی پاک کریں دیں زکوٰۃ دیں

تہجد

تم تہجد میں جو بھی مانگو گے
من وعن سب قبول کرتا ہے
میرے اللہ کا ہے یہ وعدہ
جو نہ مانگا وہ بھول کرتا ہے

خوف خدا

زندگی کا مدار ہے جس پر
ہے عبادت کا مغز خوفِ خدا
تم سخی ہو تو دو ثبوت اس کا
ہے سخاوت کا مغز خوفِ خدا

ڈاکٹر احمد علی برقیؔ اعظمی

غزل

ہے اُس کے دستِ ناز میں تیر و کمان پھر
آشوبِ روزگار میں ہے میری جان پھر
ہے آج میرا نذرِ حوادث مکان پھر
سر پر نہیں ہے میرے کوئی سائبان پھر
حالات سے ہے مشرقِ وسطیٰ کے آشکار
صیہونیت کی زد میں ہے امن و امان پھر
اُس کے لئے وسیلۂ مشقِ ستم ہوں میں
لیتا ہے میرے صبر کا وہ امتحان پھر
آنکھوں میں مثلِ خار کھٹکتا ہوں اُس کی میں
دامن پہ خوں کا میرے ہے اُس کے نشان پھر
بُغض و عناد، ظلم و ستم اُس کا ہے شعار
مانندِ تیغ چلتی ہے اُس کی زبان پھر
ازروئے مصلحت میں ہوں خاموش اس لئے
سر پر کہیں اُٹھا نہ لے وہ آسمان پھر
وہ پھر کرے گا ریشہ دوانی مرے خلاف
اِس بات کا مجھے نہ تھا وہم و گمان پھر
تیار کررہا ہے مری فردِ جرم وہ
گمراہ کن وہ دیتا ہے برقیؔ بیان پھر

شکیل حیدرؔ مچھلی شہری

غزل

گھر کے ویرانے میں جب بھی میں تنِ تنہا رہا
اپنے تن کی پیرہن کی دھجیاں گنتا رہا
موسمِ پر کیف مجھ پر مہرباں ایسا رہا
بارشیں ہوتی رہیں میرا مکاں جلتا رہا
بجلیوں کی سرزمیں سے جب نئے تنکے چنے
مدتوں اہلِ قفس میں تذکرہ میرا رہا
لے کے آیا تھا سمندر سے سخاوت کا ہنر
وہ گدائے راہ ہر ایک کو دعا دیتا رہا
ایک وہ تھے طور پہ پہنچے تجلی کے لیے
ایک میں تھا کوچۂ جانا میں ہی ٹھہرا رہا
نقشِ پائے یار پر جب رکھ دیا میں نے جبیں
دامنِ رحمت کا مجھ پر ہر گھڑی سایہ رہا
دورِ حاضر میں یہ کیسا ہے نظامِ میکدہ
رند تکتے رہ گئے پیرِ مغاں پیتا رہا
جانے کیا جذبۂ بیدار تھا میرا شکیلؔ
جس طرف دشواریاں دیکھیں ادھر بڑھتا رہا

Mohammed Abdul Khader
Cell : 9392492002
: 9885959976
HUSSAIN
KIRANA STORE
WHOLESALE & RETAIL
Specialist in : All Kinds of Catering Suppliers
22-3-480/482, Clock Tower Main Road,
Mir Alam Mandi, Hyderabad - 500 002.

حسین کیرانہ اسٹور ہول سیل اینڈ ریٹیل
H.K. Caterers
مین روڈ میر عالم منڈی حیدرآباد

ابو ہریرہ (اینکر 18 نیوز)

دولت مشترکہ کھیل: ہندوستان کی شاندار کارکردگی

آسٹریلیا کے ساحلی شہر گولڈ کوسٹ میں چار اپریل کو منعقد ہوئے 21 ویں کامن ویلتھ کھیلوں میں اس بار ہندوستان کا دبدبہ دکھا۔ نشانہ بازی۔ ویٹ لفٹنگ۔ کشتی۔ بیڈمنٹن۔ باکسنگ۔۔ ٹیبل ٹینس۔ ڈسکس تھرو۔ اسکوئش اور جیولن تھرو میں ہندوستانی کھلاڑیوں نے اپنا دم خم دکھایا۔ ہندوستانی کھلاڑیوں نے کئی ریکارڈ اپنے نام کئے۔ ہندوستان کی جھولی میں کل 66 میڈل آئے۔ جس میں 26 گولڈ۔ 20 سلور اور 20 برونز میڈل شامل ہیں۔ یہی وجہ رہی کہ اس بار دولت مشترکہ کھیلوں میں ہندوستان میڈل ٹیلی میں شروع سے ہی ٹاپ تھری پوزیشن پر رہا۔ اتفاق سے کامن ویلتھ گیمس کی تاریخ میں میڈل کے اعتبار سے اس بار ہندوستان کی کارکردگی تیسری بہترین کارکردگی ہے۔ اس ایونٹ میں انڈیا نے پانچ سویں میڈل کا سنگ میل بھی عبور کیا۔ کامن ویلتھ کھیلوں میں انڈیا کی بتدریج بہتر ہوتی کارکردگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ پچھلے پانچ ایڈیشن میں ہندوستان نے ساڑھے تین سو میڈل جیتے ہیں۔

2002 مانچسٹر میں انڈیا نے 69۔2006 ملبرن میں 50۔2010 نئی دہلی میں 101۔ گلاسگو میں 64 اور اب گولڈ کوسٹ میں 66 میڈل یعنی عالمی ٹورنامنٹ میں ہندوستان کے کھلاڑی اپنا لوہا منوا رہے ہیں اور یہ اس بات کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ ہندوستان میں کھیلوں کے اچھے دن آنے والے ہیں۔

ہندوستانی کھلاڑیوں کے اپیروچ میں کافی تبدیلی آئی ہے۔ اب کھلاڑی صرف میڈل حاصل کرنے کے لیے نہیں گولڈ حاصل کرنے کی جگت میں رہتے ہیں۔ جملہ میڈل کا جہاں تک تعلق ہے تو گولڈ کوسٹ میں گلاسگو سے صرف دو میڈل زیادہ آئے ہیں لیکن اگر سونے کے تمغے کی بات کریں تو گیارہ گولڈ میڈل کی نمایاں بہتری درج کی ہے۔

گولڈ کوسٹ میں پہلے ہی دن میرا بائی چانو نے ویٹ لفٹنگ میں طلائی تمغہ ملک کو دلایا۔ انھوں نے اسی۔ چوراسی اور چھیاسی کلو وزن اٹھایا کو کامن ویلتھ گیمس کا منفرد ریکارڈ ہے۔ اس کے بعد، میڈل کا سلسلہ چل نکلا۔

گولڈ کوسٹ میں ہندوستان نے روایتی اسٹورنگ پوائنٹس شوٹنگ۔ کشتی اور ویٹ لفٹنگ سے ہٹ ٹیبل ٹینس۔ باکسنگ۔ ڈسکس تھرو۔ بیڈمنٹن۔ اسکوئش اور جیولن تھرو میں گولڈ حاصل کیے۔ جس طرح کھلاڑیوں نے گولڈ کوسٹ میں نئی حدود کو عبور کیا وہیں جنس کی تفریق کے خطوط بھی یہاں مدھم ہوئے ہیں۔ 66 میڈل میں 35 مردوں نے حاصل کیے تو 28 خواتین نے۔

مرد کھلاڑیوں نے ایک کے بعد ایک کئی خطاب اپنے نام کئے تو وہیں ملک کی بیٹیوں نے بھی کسی بھی موقع پر مایوس نہیں کیا۔ تجربہ کار میری کام سے لیکر وینیش پھوگاٹ۔ ساکشی ملک۔ حنا سدھو۔ مانو بھاکیر۔ سیما پنیا۔ نوجیت ڈھلن۔ کرن۔ تجس ونی ساونت۔ منیکا بترا اور دیپکا پلی کل نے شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ ملک کی ان بیٹیوں پر ہمیں فخر ہے۔ کیوں کہ جہاں بیٹیوں کے ساتھ ایک طرف ناروا سلوک ہو رہا ہے تو وہیں دوسری طرف ملک کی یہ بیٹیاں دنیا میں ملک کا نام روشن کر رہی ہیں۔ ہندوستان کی ان بیٹیوں نے گولڈ۔ سلور اور براؤنز پر قبضہ جمایا۔ اور اپنے سے بہتر کھلاڑیوں کو پچھاڑ کر دنیا کے سامنے ایک مثال قائم کی ہے۔۔ پہلی بار دولت مشترکہ کھیلوں میں ہندوستانی کھلاڑی ہر محاذ پر ڈٹے نظر آئے۔ آسٹریلیا۔ انگلینڈ اور کنیڈا جیسے ممالک کے سامنے اس بار ہندوستانی کھلاڑی سینہ تان کر کھڑے نظر آئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس بار آسٹریلیا کے گولڈ کوسٹ میں ہندوستانی کھلاڑیوں نے سونے چاندی کی نچھاور کردی۔ کئی ایسے کھلاڑیوں نے گولڈ میڈل جیتے۔ جو گم نام تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے کھیل اور کارکردگی سے جہاں ملک کو گولڈ دلایا تو وہیں دنیا کو متاثر کیا۔ یہ کھلاڑی اپنے ایک پرفارمنس سے راتوں رات ملک کے ہیرو بن گئے۔ مرد کھلاڑیوں نے بھی اپنی کارکردگی سے بہت متاثر کیا۔ وکاس کرشنا۔ سوم ویر۔ نیرج چوپڑا۔ سمت ملک۔ کچھ ایسے نام ہیں جنہوں نے ملک کو گولڈ مڈل دلایا۔ ان کھلاڑیوں میں بے پناہ صلاحیت ہے۔ یہ کسی بھی پلیٹ فارم پر اپنی کارکردگی سے متاثر کر سکتے ہیں۔ ان کھلاڑیوں کو اگر صحیح رہنمائی ملے اور ان پر مزید محنت کی جائے تو یہ اولمپک میں بھی مایوس نہیں کریں گے۔

ماہنامہ صدائے شبلی میں ہر ماہ ادارے کی طرف سے کتاب پر تبصرہ کیا جائے گا، اس لئے مصنفین، مولفین اور مرتبین سے گزارش ہے کہ وہ تبصرے کے لئے دو عدد کتابیں ضرور ارسال کریں۔ (ادارہ)

القاموس الازہر ایڈوانس (اردو۔عربی)

مؤلف: ڈاکٹر زکریا ازہری

مبصر: عزیر احمد

ناشر: مکتبۃ الفہیم، مئوناتھ بھنجن، یوپی

سال اشاعت: مارچ 2014۔ صفحات 1168۔ قیمت 595

دہلی میں ملنے کا پتہ: الہدیٰ پبلی کیشنز، کوچہ نیل کنٹھ، قاضی واڑہ، دریا گنج، نئی دہلی

ڈکشنری (لُغت) دو زبانوں کے درمیان ایک پل کا کام کرتی ہیں۔ زبانوں کی تدریس اور سیکھنے کے عمل میں لغت کا رول سب سے اہم ہے۔ اس کے بغیر زبان کے سیکھنے کا عمل ممکن نہیں ہے۔ ایسی بات نہیں ہے کہ لغت کی ضرورت صرف ان لوگوں کو پڑتی ہے جو اس زبان کو سیکھ رہے ہوں ڈکشنریوں کی ضروت زبان کے ماہرین کو بھی ہوتی ہے۔ زندہ زبانوں میں روزانہ نئے نئے الفاظ اور اصطلاحات کا اضافہ ہوتا رہتا ہے اور یہ عمل ہمیشہ جاری رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس 'آکسفورڈ لرنرز ڈکشنری' کا ہر سال نیا ایڈیشن شائع کرتی ہیں جس میں نئے الفاظ وتعبیرات کا اضافہ شامل ہوا کرتا ہے۔

عربی اور اردو کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ اردو اور عربی دونوں زبانوں میں گہرا ربط ہے۔ عربی، اسلامی علوم وفنون کی زبان ہونے کے کی وجہ سے ایک علمی زبان ہے۔ عربی اقوام متحدہ کی زبانوں میں سے ایک ہے۔ موجودہ عالم کاری کے عہد میں عربی میں روزگار کے ذرائع دنیا کی کسی بھی زبان سے زیادہ ہیں۔ عربی زبان کی اہمیت کے لئے یہی کافی ہے کہ قرآن وحدیث اور اسلامیات کا پورا سرمایہ اسی زبان میں ہے۔ اس وجہ مسلمانوں کے لئے اس زبان سے راہ فرار نہیں۔ جہاں تک اردو کی بات ہے تو یہ برصغیر ہندو پاک میں رابطہ کی زبان ہے۔ اردو، پاکستان کی طرح اگرچہ ہندستان کی قومی زبان نہیں ہے لیکن اپنی مٹھاس اور دلکشی کی وجہ سے کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ خاص طور پر اسلامیات کا جتنا بڑا ذخیرہ اردو میں ہے عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کی ابتداء سے ہی دونوں زبانوں میں ترجمہ کا عمل جاری وساری ہے۔

ہم اردو والوں کی بدنصیبی ہے کہ ہمارے یہاں ہر سال ڈکشنریوں کو revise کرنے کی روایت نہیں ہے۔ مصباح اللغات، قاموس الجدید، قاموس الاصطلاحی اور المنجد (مترجم) وغیرہ کو لکھے ایک زمانہ ہوگیا۔ لیکن نہ ان ڈکشنریوں میں نئے زمانے کے حساب سے کوئی اضافہ کیا گیا اور نہ کوئی نئی ڈکشنری لکھی گئی۔ جو ڈکشنریاں لکھی گئیں ان میں بھی ایک یا دو کو چھوڑ کر سبھی عربی سے اردو زبان میں ہیں۔ اردو سے عربی ڈکشنریوں میں میرے ناقص علم میں القاموس الجدید اور القاموس الفرید کے علاوہ کوئی مستقل ڈکشنری نہیں لکھی گئی۔ یہی معاملہ اردو سے اردو، اردو سے انگریزی اور انگریزی سے اردو ڈکشنریوں کا بھی ہے۔ ایک زمانہ گزر گیا لیکن وہ قدیم ڈکشنریاں جو سالوں

پہلے لکھی گئی تھیں، کوئی متبادل نہ ہونے کی وجہ سے اب بھی طلبہ انہی سے کو استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔ لغت لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے دن رات ایک کرنا پڑتا ہے۔ ڈکشنری لکھنے کا عمل کس قدر پیچیدہ ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ عام طور پر یہ کام اداروں کی سرپرستی میں ماہرین کی ٹیم انجام دیتی ہے۔ اردو سے عربی یا عربی سے اردو کی کوئی ڈکشنری اب تک ہماری نظر سے نہیں گزری جو ٹیم ورک کا نتیجہ ہو۔ اس وجہ سے ہمارے پیش رو علماء جنہوں نے ڈکشنریاں لکھ کر زبانوں کے سیکھنے کا راستہ آسان کیا ہے وہ ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔ لیکن یہ سبھی ڈکشنریاں اب موجودہ زمانے میں طلبہ، اساتذہ اور مترجمین کی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے ناکافی ہیں۔ عربی اور اردو زبان میں ہزاروں ایسے الفاظ وجود میں آگئے ہیں جن کے معانی ان ڈکشنریوں میں نہیں ہیں۔

ایک ایسی لغت کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی جس میں جدید لٹریچر، بینکنگ، میڈیا، انجینرنگ، مینجمنٹ، اور دیگر علوم کی جدید اصطلاحات وتعبیرات کا احاطہ کیا گیا ہو اور مترجمین کے لئے ایک ایسے ٹول کا کام کرے جہاں انہیں اپنے مطلب کی ساری چیزیں دستیاب ہوں۔ یہ کام مشکل بھی ہے اور صبر آزما بھی۔ ہمارے دوست ڈاکٹر محمد ذکریا ازہری صاحب نے اس چیلنج کو قبول کیا اور ستر ہزار الفاظ کی ایسی جامع ڈکشنری تیار کی جو مذکورہ صفات کی حامل ہے۔

ڈاکٹر محمد زکریا ازہری نے اس ڈکشنری میں صرف 70,000 اردو الفاظ واصطلاحات کی عربی تعبیر ہی نہیں پیش کی ہے (بقیہ صفحہ ۳۲ پر)

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم

شاہی ہلز شاہین نگر حیدرآباد

تعارف واپیل

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم شاہی ہلز شاہین نگر حیدرآباد میں ۱۵ر جنوری ۲۰۱۷ء کو قائم کیا گیا تاکہ امت مسلمہ کے نونہالان زیور علم سے آراستہ ہوں اور ملک وملت کی خدمت میں وقف ہو جائیں۔ اللہ رب العزت ان مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔ آمین یارب العلمین۔

مدرسہ ہذا اقامتی غیر اقامتی ہے۔ فی الحال اقامتی میں شعبہ ناظرہ، شعبہ حفظ، اردو، انگلش، حساب اور کمپیوٹر کی تعلیم کا عمدہ نظم ہے۔ کیونکہ مدرسہ ہذا کو الحمدللہ ان علوم کے ماہرین کی خدمات حاصل ہے۔ ان شاءاللہ مستقبل قریب میں مزید وسائل کے فراہم ہونے کی صورت میں درس نظامیہ اور مختصر مدتی عالم کورس، سیرت نبویؐ، تاریخ، دستورِ ہند وغیرہ کے شعبہ جات قائم کرنے کا ارادہ ہے اور ایسے افراد ان شاءاللہ تیار کرنا ہے جو عربی، انگلش، اردو زبان وغیرہ پر مکمل دسترس رکھیں، تاکہ ملک میں قومی یکجہتی اور بھائی چارگی کا بول بالا ہو۔ اللہ رب العزت ان عزائم ومقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔ آمین۔

مدرسہ ہذا اور ٹرسٹ کو کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے۔ جملہ اخراجات کی ادائیگی اہل خیر حضرات کے تعاون سے ہوتی ہے، اور کوئی فیس طالب علموں سے نہیں لی جاتی ہے۔ ایک طالب علم پر ماہانہ خرچ تقریباً ۱۵۰۰ر پندرہ سو روپے ہے۔ فی الحال مدرسہ کا ماہانہ خرچ تقریباً ۵۰۰۰۰ر پچاس ہزار روپے ہے۔ اس وجہ سے آپ تمام حضرات سے گزارش ہے کہ دامے درمے، سخنے، زکوۃ، صدقات، عطیات اور اشیاء جات سے تعاون فرما کر ثواب دارین حاصل کریں۔ جزاکم اللہ واحسن الجزاء۔

Ac No: 1327104000065876 Bank Name: IDBI
Ac N: SHIBLI INTERNATIONAL ADUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST
IFS: IBL0001327. Branch: Charminar